زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہار سو
راولپنڈی

شجرہ نسب خانوادہ صدیقیقان
موضع کھیانی ضلع گوجرانوالہ

- حضرت داتا شاہ جمال نودی
  - احمد دین
  - عنایت اللہ
  - نور احمد
  - امان اللہ
  - محمد علی
  - شیر محمد غازی
    - سید محمد
    - علی احمد
    - محمد شاہ
    - محمد فیض
      - نور احمد
        - محمد حیات
        - محمد سلطان
        - کرم الٰہی
        - غلام قاسم
          - حسام الدین
          - محبوب عالم
            - غلام قادر زیرک
              - غلام جیلانی
              - غلام ربانی
              - فضل الٰہی
                - سلیم اللہ
                - فاروق نعیم
                - ضمیر علی
                - محمد اسماعیل
                - ظہیر
            - محمد عبداللہ
            - فضل قادر
  - خدا بخش
    - محمد سعید
      - صدر الدین
      - نظام دین
        - محمد اشرف
          - امیر علی
            - محمد لطیف
              - ڈاکٹر وحید قریشی
          - احمد علی
          - حامد علی
          - ایم دین
          - الٰہی بخش
      - کرم الٰہی
      - حکیم آبادی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد:۱۶ شمارا جنوری فروری ۲۰۰۷ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگۂ شکیبانہ

چہارسُو کا زیرِ نظر شمارہ

امریکہ، برطانیہ، سعودی عرب، ترکی، ہندوستان اور پاکستان

کے اُن نوعمر، نوخیز، نوبہار، معصوم اور شگفتہ چہروں

سے منسوب ہے

جنہوں نے بڑے صیاد کی جانب سے چھوٹے صیاد کے

بے بس اور عبرتناک انجام پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے

امن اور انصاف کی آرزو میں اپنی زندگی کے

چراغ خود گُل کر لئے!

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاون

رابطہ: 537 ویسٹریج-III راولپنڈی فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسُو

○ ○ ○

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر وحید قریشی

کے نام

ریگِ رواں

(۱)

ابھی یاد کے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
ابھی سردِ آزاد بے قید امروز فردا رہے گا
ابھی رات آغوشِ گیتی میں سوئی ہوئی ہے
مقدر مگر جاگتا ہے۔

(۲)

کہیں نقرئی گھنٹیاں ...... کارواں
کہیں آہوانِ ختن راہ پیا
کہیں منزلِ زندگی اک سلگتا ہوا آرزوؤں کا دُھواں
ازل سے ابد تک وہی داستاں
مگر زندگی دیکھتی ہے
سوتی کے پھولوں پہ کرنوں کی جھرمٹ
مچلتی ہوئی چاندنی
لہلہاتے ہوئے پھول دامنِ برق پا پر
شگوفوں کے گلزار پھیلا رہی ہے
فضا درد کی راگنی گا رہی ہے
ازل سے ابد تک یہی داستاں
وقت ریگِ رواں

وحید قریشی

○ ○ ○

حیاتِ عاشقہ

مصطفٰے ملک

نام: عبدالوحید
قلمی پہچان: ڈاکٹر وحید قریشی
تخلص: وحید
ولدیت: محمد لطیف قریشی (۱۳ دسمبر ۱۸۹۸ء تا یکم اگست ۱۹۹۱ء)
حیثیات: ادیب، شاعر، نقاد، محقق، معلم، ماہر فنون لطیفہ، ماہر لسانیات، ماہر تعلیمات، ماہر اقبالیات، مخطوطہ شناس، تاریخ دان، مزاح نگار، کالم نویس، منتظم۔
موضوعات: ادب، زبان، تنقید، تحقیق، تدوین، تاریخ، تعلیم، نفسیات، فنون لطیفہ، عمرانیات، ابلاغیات۔
وسیلۂ اظہار: اردو، فارسی، پنجابی، انگریزی۔
تاریخ پیدائش: ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء
مولد: میانوالی (یہاں ڈاکٹر وحید قریشی کے ابا بسلسلہ ملازمت قیام پذیر تھے)
آبائی مسکن: گوجرانوالہ
شادی: ۲ مئی ۱۹۵۳ (سعیدہ وحید، ایم اے (اردو)
اولاد: نورین وحید (اکلوتی بیٹی) زوجہ مظہر منیر
ملازمت کا آغاز: یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء (بطور ریسرچ سکالر)
ریٹائرمنٹ: ۱۳ فروری ۱۹۸۵ء
اسفار: چین، ہندوستان (دو مرتبہ)، سعودی عرب (بسلسلہ عمرہ)، ایران، تاجکستان، انگلستان۔
اقامت: ۲۱۵، ای ایم ای کالونی، ملتان روڈ، لاہور
فون: 042-7512724
تعلیمی کوائف:
جماعت اول پرائمری سکول چک نمبر ۱۲ کسووال ضلع ساہیوال ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۲ء
جماعت دوم سوم: میونسپل سکول میانوالی ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳ء
جماعت چہارم تا پنجم: ڈسٹرکٹ بورڈ سکول حویلی ضلع ساہیوال ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۵ء
جماعت ششم تا ہشتم: محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء
میٹرک: (الف) جماعت نہم (i) سنٹرل ماڈل سکول لاہور تقریباً ایک ماہ
(ii) اسلامیہ ہائی سکول شملہ تقریباً آٹھ ماہ
(iii) اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۰ء
(ب) جماعت دہم: (ایک اضافی مضمون کے ساتھ): اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ، لاہور، ۱۹۴۰ء (امتحان مارچ ۱۹۴۰ء)
ایف اے (اردو بحیثیت اضافی مضمون کے ساتھ)، گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۴۲ء (سند مارچ ۱۹۴۲ء)
بی اے (آنرز فارسی) مع اضافی زبان اردو بحیثیت جدید ہندوستانی زبان) گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۴۴ء (ڈگری ۲۱ دسمبر ۱۹۴۴ء)
ایم اے (فارسی)، گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۴۶ء (امتحان جون ۱۹۴۶ء)
ایم اے (تاریخ)، گورنمنٹ کالج لاہور (تکمیل نصاب) ۱۹۴۷ء (امتحان ۷ اکتوبر ۱۹۵۰ء، ڈگری ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء)
پی ایچ ڈی (فارسی)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۵۲ء (ڈگری ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء)
ڈی لٹ (اردو)، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۵ء (ڈگری ۲۱ مئی ۱۹۶۵ء)

سلسلہ ملازمت

(۱) الفریڈ پٹیالہ ریسرچ سکالر، شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی لاہور (یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۴۹ء + یکم اکتوبر تا ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء)
(۲) لیکچرر تاریخ، اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ (۶ فروری ۱۹۵۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء)
(۳) لیکچرر تاریخ، اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ لاہور (۲ جنوری ۱۹۵۷ء تا ۲۴ اگست ۱۹۵۸ء)
(۴) لیکچرر و صدر شعبہ فارسی، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور (۲۵ اگست ۱۹۵۸ء تا ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء)
(۵) لیکچرر اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۲۱ دسمبر ۱۹۶۲ء تا ۳۰ دسمبر ۱۹۶۶ء)
☆ سیکرٹری و ڈائریکٹر (ایسوسی ایٹ پروفیسر/ ریڈر کے مساوی عہدہ) ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، محکمہ اوقاف، لاہور، سیکرٹری تنظیم نو کمیٹی دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور (۲ دسمبر ۱۹۶۲ء تا ۲ ستمبر ۱۹۶۳ء)
(۶) ریڈر (ایسوسی ایٹ پروفیسر) اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور (۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تا ۲۳ اپریل ۱۹۷۵ء)

☆ انچارج شعبہ پنجابی اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹ ستمبر ۱۹۷۰ء تا نومبر ۱۹۷۱ء)

☆ صدر شعبہ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور (یکم جنوری ۱۹۷۳ء تا ۳۰ اپریل ۱۹۷۵ء)

☆ ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۳۰ اپریل ۱۹۷۵ء تا یکم فروری ۱۹۸۱ء)

(۷) طالب پروفیسر، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور (۲۵ اپریل ۱۹۷۳ء تا ۱۳ فروری ۱۹۸۵ء)

☆ صدر شعبہ پنجابی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور (یکم ستمبر ۱۹۷۶ء تا یکم مارچ ۱۹۷۷ء)

(۸) پرنسپل، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۳ اگست ۱۹۸۹ء تا ۵ اپریل ۱۹۸۳ء)

☆ صدر شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور (یکم مارچ ۱۹۷۹ء تا ۵ اپریل ۱۹۸۲ء)

☆ (اضافی چارج) ڈائریکٹر سادرن ایشین سنٹر نیو کیمپس پنجاب یونیورسٹی لاہور (تقریباً ایک سال ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۱ء)

☆ ناظم (اضافی فرائض)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور (۲۷ جولائی ۱۹۸۲ء تا ۴ اپریل ۱۹۸۳ء)

(۹) صدر نشین، مقتدرہ قومی زبان، کراچی/اسلام آباد (۷ اپریل ۱۹۸۳ء تا ۴ نومبر ۱۹۸۷ء (NPS-22)

(۱۰) معتمد (اعزازی) بزم اقبال، لاہور (۲۸ نومبر ۱۹۸۷ء تا ۲۶ مارچ ۱۹۹۴ء)

(۱۱) پروفیسر حمید نظامی چیئر، شعبہ ابلاغیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۲۳ فروری ۱۹۹۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء)

(۱۲) ناظم، اقبال اکادمی پاکستان لاہور (۹ ستمبر ۱۹۹۳ء تا ۱۲ جون ۱۹۹۷ء)

(۱۳) وزٹنگ پروفیسر، شعبہ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۵ اکتوبر ۲۰۰۰ء تا ۲۵ دسمبر ۲۰۰۲ء)

(۱۴) جنرل سیکرٹری (اعزازی)، اردو اکیڈمی پاکستان "مغربی پاکستان اردو اکیڈمی" لاہور (۱۰ نومبر ۱۹۸۶ء تا حال)

(۱۵) ممتاز پروفیسر (تا حیات) جی سی یونیورسٹی لاہور ستمبر ۲۰۰۲ء تا حال

ادارتی خدمات

(۱) "مجلہ علمی" لاہور، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان ۱۹۶۴ء

(۲) "صحیفہ" لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۴ء

(۳) "مجلہ تحقیق" لاہور، جامعہ پنجاب ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۲ء

(۴) "اورینٹل کالج میگزین" لاہور، یونیورسٹی اورینٹل کالج ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء

(۵) "اقبال ریویو" (اردو، انگریزی، فارسی) لاہور، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۷ء

(۶) "اخبار اردو" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۷ء

(۷) "اقبال" لاہور، بزم اقبال ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۴ء

(۸) "مخزن" لاہور، قائد اعظم لائبریری ۲۰۰۱ء تا حال

اعزازات

(۱) نیاز فتح پوری میڈل ۱۹۸۴ء

(۲) طفیل ایوارڈ ۱۹۸۶ء

(۳) ہمدرد تمغۂ اعزاز

(۴) صدارتی تمغہ حسن کارکردگی، حکومت پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۹۴ء

(۵) اقبال ایوارڈ، حکومت پاکستان ۲۰۰۳ء

تصنیفات

(۱) شبلی کی حیات معاشقہ، لاہور مکتبہ جدید (طبع اول) ۱۹۵۰ء لاہور ٹی اینڈ ٹی پبلشرز (طبع دوم) ۲۰۰۴ء

(۲) Insha Literature in Persian - A cricitl study مقالہ برائے پی ایچ ڈی (فارسی)، نگران: ڈاکٹر سید عبداللہ اور عباس شوستری لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۴ء (غیر مطبوعہ)

(۳) میر حسن اور ان کا زمانہ (مقالہ برائے ڈی لٹ اردو)، لاہور، اردو بک سٹال ۱۹۵۹ء

(۴) مطالعہ حالی (مجموعہ مقالات)، لاہور، اردو بک سٹال (طبع اول) ۱۹۶۱ء لاہور دارالادب (طبع دوم مع ترمیم و اضافہ) ۱۹۶۶ء

(۵) کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ (مجموعہ مقالات)، لاہور مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۵ء

(۶) تنقیدی مطالعے (مجموعہ مقالات) لاہور مکتبہ کاروان ۱۹۶۷ء

(۷) نقد جاں (شعری مجموعہ) لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۶۸ء

(۸) باغ و بہار ایک تجزیہ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز (طبع اول) ۱۹۶۸ء، لکھنؤ نصرت پبلشرز (طبع دوم) ۱۹۸۲ء

(۹) Oriental Studies (مجموعہ مقالات) لاہور، زریں بک ایجنسی ۱۹۶۹ء، سنگ میل پبلی کیشنز (طبع دوم با اضافہ نئے ایڈیشن) ۱۹۷۰ء، (طبع سوم) مجلس یادگار غالب، کراچی ۲۰۰۴ء

(۱۰) نقد غالب (مجموعہ مقالات) طبع اول ۱۹۷۰ء

(۱۱) پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، لاہور، ایجوکیشنل ایمپوریم ۱۹۷۳ء
(۱۲) قرآن حکیم کی روشنی میں تعلیم (پمفلٹ) لاہور، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۷۵ء
(۱۳) اقبال اور پاکستانی قومیت (مجموعہ مقالات) لاہور، مکتبہ عالیہ ۱۹۷۷ء
(۱۴) قائداعظم اور تحریک پاکستان (مجموعہ مقالات) لاہور، مکتبہ عالیہ ۱۹۷۷
(۱۵) Ideological Foundations of Pakistan لاہور، عزیز پبلشرز (طبع اول) ۱۹۸۲ء، لاہور، اسلامک بک فاؤنڈیشن (طبع دوم) ۱۹۸۷ء
(۱۶) پاکستانی قومیت کی تشکیل نو اور دوسرے مضامین، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۳ء
(۱۷) الواح (شعری مجموعہ اردو و پنجابی) فیصل آباد، قرطاس، اگست ۱۹۸۴ء
(۱۸) دفتری اردو (پمفلٹ ۱۷)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
(۱۹) اردو نثر کے میلانات (مجموعہ مقالات)، لاہور، مکتبہ عالیہ ۱۹۸۶ء
(۲۰) قومی زبان اور ہمارا قومی تشخص (پمفلٹ ۲۰)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء
(۲۱) اردو بحیثیت قومی زبان (پمفلٹ ۲۱)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
(۲۲) تحریک پاکستان کے ثقافتی عوامل (پمفلٹ ۱۵)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
(۲۳) ہمارا نظام تعلیم اور قومی زبان، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
(۲۴) مقالات تحقیق (مجموعہ مقالات)، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۸۸ء
(۲۵) جدیدیت کی تلاش میں (مجموعہ مقالات)، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء
(۲۶) اساتذی ادب (مجموعہ مقالات)، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، طبع دوم ۲۰۰۳ء
(۲۷) ڈھلتی عمر کے نوحے (شعری مجموعہ)، (زیر طبع)
(۲۸) اساسیات اقبال (مجموعہ مقالات)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء طبع دوم ۲۰۰۲ء
(۲۹) مطالعہ ادبیات فارسی (مجموعہ مقالات)، لاہور، یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۹۶ء
(۳۰) پاکستان کے تعلیمی مسائل (ڈی۔پی۔ایس، اسلام آباد)
(۳۱) اردو ادب کا ارتقاء ایک جائزہ، آفر بک ڈپو، اردو، ۲۰۰۶ء

ترتیب وتدوین

(۱) اردو کا بہترین انشائی ادب..... رجب علی بیگ سرور سے دور حاضر تک (۲) ارمغان ایران (۳) ارمغان لاہور (۴) ۱۹۶۵ء کے بہترین مقالے (۵) پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی (۶) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد ششم (اردو ادب، جلد اول) (۷) توضیحی کلیات بلوغیات (باشتراک سید جمیل احمد رضوی) (۸) ثواقب المناقب از محمد ملا صدیق کجاہی (۹) دیوان دل (۱۰) دیوان آتش (۱۱) دیوان جہاں دار از مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ (۱۲) دیوان سودا (۱۳) صحیفہ، لاہور، غالب نمبر (حصہ اول، پنجم) (۱۴) علامہ اقبال کی تاریخ ولادت (باشتراک زاہد منیر عامر) (۱۵) عمل صالح الموسوم بہ شاہجہان نامہ (تین جلدیں) از محمد صالح کنبوہ (۱۶) مثنویات حسن (جلد اول) (۱۷) مثنوی چندر بدن مہیار از قادر بخش وزیر آبادی (۱۸) مثنوی سحر البیان (۱۹) مقدمہ شعر و شاعری (۲۰) منتخب مقالات اقبال ریویو (۲۱) نامہ عشق از لارجیت منشی (۲۲) ہمیشہ بہار (تذکرہ شعرائے فارسی) از کشن چند اخلاص (۲۳) یادنامہ (ی حرفیاں) از عبدی قیصر شاہی (۲۴) یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی، ادبی اور درسی سرمایہ (۲۵) یونیورسٹی اورینٹل کالج کے ریسرچ اسکالروں اور اساتذہ کی علمی وادبی فہرست۔

مقالات

مختلف موضوعات پر ڈاکٹر وحید قریشی کے ایک سو سے زائد مقالات ایسے ہیں جو ان کی کسی کتاب میں شامل نہیں۔ اس طرح سو سے زائد تحریریں دیباچوں، تعارف ناموں، مقدموں اور تبصروں کی صورت میں موجود ہیں جبکہ انٹرویو، تراجم، روزنامہ ''جنگ'' اور ''پاکستان'' لاہور میں لکھے گئے کالموں اور زیر ادارت رسائل کے لئے لکھے جانے والے اداریوں کی تعداد الگ ہے۔

مطالعہ وحید قریشی

(۱) ڈاکٹر وحید قریشی.... حیات اور ادبی کارنامے، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے (اردو)، ممتاز حسین نعیم (مقالہ نگار)، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (نگران مقالہ)، لاہور، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء
(۲) محفل، ماہنامہ، لاہور، ڈاکٹر وحید قریشی نمبر، فروری ۱۹۹۰ء
(۳) آواز جرس، ہفت روزہ، لاہور (ڈاکٹر وحید قریشی نمبر) ۹ تا ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء
(۴) ڈاکٹر وحید قریشی.... بطور غالب شناس، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے (اردو)، صبا انجم (مقالہ نگار)، ڈاکٹر سید معین الرحمن (نگران مقالہ)، لاہور، گورنمنٹ کالج، ۱۹۹۲ء
(۵) ڈاکٹر وحید قریشی... بطور اقبال شناس، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے (اردو)، روزینہ فاروق (مقالہ نگار)، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (نگران مقالہ) لاہور، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۸ء

(۶) ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیفات کا سرسری جائزہ' مقالہ برائے ایم اے (اردو)' محمد رمضان (مقالہ نگار)' ڈاکٹر روش آرا راؤ (نگران مقالہ)' بہاولپور' اسلامیہ یونیورسٹی' تعلیمی سال ۹۷-۱۹۹۶ء

(۷) ڈاکٹر وحید قریشی... احوال و آثار (بسلسلہ معماران ادب اردو)' ڈاکٹر گوہر نوشاہی اسلام آباد' اکادمی ادبیات (زیر اشاعت)

(۸) ڈاکٹر وحید قریشی کی تدوینی خدمات' مقالہ برائے ایم فل (اردو) عبدالغفار شاہین (مقالہ نگار)' زاہد منیر عامر (نگران مقالہ) [زیرغور]' اسلام آباد' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (زیر تکمیل)

(۹) مقالہ پی ایچ ڈی' نمل یونیورسٹی' اسلام آباد۔ روبینہ ناز

(۱۰) اردو کے نفسیاتی نقاد (ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر سلیم اختر) مقالہ برائے ایم اے (اردو) سعیدہ بانو (مقالہ نگار) ڈاکٹر روبینہ ترین (نگران مقالہ)' بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی' ملتان ۱۹۸۷ء

نگران پی ایچ ڈی مقالات (اردو)

۱۔ ڈاکٹر اسد علی ادیب "اردو میں بچوں کا ادب" ۱۹۶۷ء

۲۔ ڈاکٹر عبدالرزاق نظیم "شاہ نصیر دہلوی" ۱۹۷۳ء

۳۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ" ۱۹۷۶ء

۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر "اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان" ۱۹۷۸ء

۵۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی "اقبالیات: تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" ۱۹۸۱ء

۶۔ ڈاکٹر رشید گل "اردو ادب میں عیسائیوں کی خدمات" ۱۹۸۱ء

۷۔ ڈاکٹر روش آرا راؤ "ادبیات اردو کے ارتقا میں رسائل کا حصہ" ۱۹۸۱ء

۸۔ ڈاکٹر ریاض الحق طاہر (ریاض مجید) "اردو نعت" ۱۹۸۳ء

۹۔ ڈاکٹر فضل میراں گوہر نوشاہی "لاہور کے چشتی خاندان کی علمی و ادبی خدمات" ۱۹۸۳ء

۱۰۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری "سعادت حسن منٹو" ۱۹۸۶ء

۱۱۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی "صوفی غلام مصطفےٰ تبسم' حیات و فن" ۱۹۸۶ء

۱۲۔ ڈاکٹر طارق عزیز "اردو رسم الخط اور ٹائپ کا مسئلہ" ۱۹۸۶ء

۱۳۔ ڈاکٹر محمد بشیر سیفی "اردو میں انشائی ادب کا ارتقا (قدیم انشا سے جدید انشایئے تک" ۱۹۸۶ء

۱۴۔ ڈاکٹر محمد ایوب شاہد "دیوان غالب (اردو) کی شروح کا تقابلی مطالعہ" ۱۹۸۶ء

۱۵۔ ڈاکٹر سید مرتضیٰ زیدی "شوکت تھانوی" ۱۹۸۶ء

۱۶۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی "حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات" ۱۹۸۷ء

۱۷۔ ڈاکٹر اعجاز حنیف "عزیز احمد... زندگی اور کارنامے" ۱۹۸۹ء

صحافت

۱۸۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی "پنجاب میں اردو اخبار نویسی" ۱۹۸۱ء

پنجابی

۱۹۔ ڈاکٹر شہباز ملک "مولوی احمد یار... فکر تے فن" ۱۹۸۳ء

۲۰۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید "قیام پاکستان توں بعد پنجابی ادب دا ارتقاء" ۱۹۸۶ء

۲۱۔ ڈاکٹر ثریا احمد "پنجابی غزل کا ارتقاء" ۱۹۹۹ء

نگرانی ایم اے مقالات

اردو

۱۔ فرحت یاسمین "اردو نظم میں اقبال کا مرتبہ" ۱۹۶۱ء (نظر ثانی)

۲۔ محمد زکریا خواجہ "اردو میں قطعہ نگاری" ۱۹۶۱ء

۳۔ اظہر حسین رضوی سید "حکیم' حالات' کلام' انتخاب" ۱۹۶۲ء

۴۔ ذوالفقار حسین بخاری "سید سلیمان ندوی" ۱۹۶۲ء

۵۔ نگہت افزا بخاری "اردو ادب میں شخصیت نگاری" ۱۹۶۳ء

۶۔ نوشابہ اختر "غزل کے اصول (نگرانی باشتراک سید عبداللہ)" ۱۹۶۳ء

۷۔ محمد افضل ملک "فہرست مخطوطات اردو شاعری' پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور" ۱۹۶۳ء (نگرانی باشتراک پروفیسر افتخار احمد صدیقی)

۸۔ محمد ارشد کیانی "مولانا عبدالسلام ندوی" ۱۹۶۳ء

۹۔ محمد صالحین (تبسم کاشمیری) "جدید اردو شاعری میں رمزیت (علامت نگاری)" ۱۹۶۳ء

۱۰۔ تسنیم اختر "مجنوں گورکھپوری" ۱۹۶۴ء

۱۱۔ سلیم ایم اے "چودھری خوشی محمد ناظر" ۱۹۶۴ء

۱۲۔ خورشید بیگم "وحید الدین سلیم اور ان کی ادبی خدمات" ۱۹۶۴ء

۱۳۔ بلقیس جمال اطہر "ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کے موضوعات کا تنقیدی جائزہ" ۱۹۶۵ء

۱۴۔ عابدہ عبدالحق "آرزو لکھنوی" ۱۹۶۵ء

۱۵۔ عبدالرزاق نظیم "شاہ نصیر دہلوی" ۱۹۶۵ء

۱۶۔ احمد علی "سید احسن مارہروی" (۱۸۸۷ء تا ۱۹۴۰ء) ۱۹۶۶ء

۱۷۔ ارشاد فاطمہ "شوق قدوائی" ۱۹۶۶ء

۱۸۔ شمیم اختر "مس" "اثر صہبائی" ۱۹۶۶ء

۱۹۔ مسعودہ حمید "صفی لکھنوی" ۱۹۶۶ء
۲۰۔ معراج تبسم سید "وادیٔ مہران میں اردو شاعری" ۱۹۶۷ء
۲۱۔ زرینہ گل "پیارے صاحب رشید" ۱۹۶۷ء
۲۲۔ فہمیدہ رشید "میر حسن کی کردار نگاری" ۱۹۶۷ء
۲۳۔ محمد یوسف طاہر "مولانا غلام رسول مہر" ۱۹۶۷ء
۲۴۔ حفیظ الرحمٰن طاہر تونسوی "ملتان کے اردو شعراء... ایک تذکرہ" ۱۹۶۸ء
۲۵۔ فرحت اقبال "محمد الدین فوق" ۱۹۶۸ء
۲۶۔ نسرین "راجا مہدی علی خان" ۱۹۶۸ء
۲۷۔ نسیم اختر "خان احمد حسین کی ادبی خدمات" ۱۹۶۹ء
۲۸۔ تسنیم جہاں طور "اردو ڈراما کا آغاز و ارتقاء" ۱۹۶۹ء
۲۹۔ ساجدہ بتول "اردو کے چار صوفی شعراء" ۱۹۷۰ء
۳۰۔ رخشندہ گل "اردو کے چار غزل گو" ۱۹۷۰ء
۳۱۔ عصمت افزاء "اقبال کے نظامِ فکر میں عورت کا مقام" ۱۹۷۰ء
۳۲۔ پروین اختر "گورنمنٹ کالج کی ادبی خدمات" ۱۹۷۱ء
۳۳۔ خالدہ خالد "سرسید کے ادبی و تنقیدی نظریات" ۱۹۷۱ء
۳۴۔ خالدہ جمیل "صبا لکھنوی" ۱۹۷۱ء
۳۵۔ ثریا انور "دبستان رام پور کے شعراء" ۱۹۷۳ء
۳۶۔ شمیم قریشی "نجم الغنی رامپوری" ۱۹۷۳ء
۳۷۔ شہناز مجید "فروغِ اردو میں انجمن حمایت اسلام کا حصہ" ۱۹۷۳ء
۳۸۔ نسرین اختر "فسانۂ آزاد میں لکھنوی معاشرت کی عکاسی" ۱۹۷۳ء
۳۹۔ محمد صادق "منشی غلام قادر فصیح اور ان کی ادبی خدمات" ۱۹۷۳ء
۴۰۔ اختر حمید "اصغر گونڈوی کی جمال پرستی" ۱۹۷۳ء
۴۱۔ تنویر احمد بٹ "اقبال کا قیام یورپ" ۱۹۷۳ء
۴۲۔ توقیر زہرا سید "ذوق کی قصیدہ نگاری" ۱۹۷۳ء
۴۳۔ خالد محمود "شیخ اسماعیل پانی پتی" ۱۹۷۳ء
۴۴۔ سعید نیازی "نواب نصیر حسین خیال کی ادبی خدمات" ۱۹۷۳ء
۴۵۔ رفعت انور "میر ولی اللہ" ۱۹۷۳ء
۴۶۔ فرزانہ انور "پاکستانی رسائل بسلسلہ غالب صدی، تنقیدی و تحقیقی جائزہ" ۱۹۷۵ء
۴۷۔ خدیجہ پروین "وادیٔ جہلم کے شعراء" ۱۹۷۶ء (تحقیقی اعانت)
۴۸۔ عطیہ سعید "تقسیم برصغیر پاکستان کے اہم اردو ناول نگاروں کے آئینے میں" ۱۹۷۷ء
۴۹۔ محمد صدیق شاد "صوفی تبسم کی اردو شاعری" ۱۹۷۸ء
۵۰۔ پرویز احمد چوہدری "ساغر صدیقی (حیات اور شاعری)" ۱۹۷۹ء
۵۱۔ شمیم آغا قزلباش "خواجہ غلام فرید کی اردو شاعری" ۱۹۸۰ء
۵۲۔ ثروت صدیقی "رشید گورگانی اور ان کی شاعری" (س۔ن)
۵۳۔ ریاض قدیر "حجۃ الاسلام (تصحیح متن)" ۱۹۸۰ء

پنجابی

۵۴۔ محمد اسلم ورک "میاں ہدایت اللہ (حیاتی تے کلام)" ۱۹۷۳ء
۵۵۔ شاہد پرویز شاہین "حافظ برخوردار" ۱۹۷۳ء
۵۶۔ شہزاد بخاری "فہرست مخطوطات پنجابی کتب خانہ جامعہ پنجاب" ۱۹۷۳ء
۵۷۔ شہناز ملک "فارسی رسم الخط وچ چھپیاں پنجابی کتاباں" ۱۹۷۳ء
۵۸۔ محمد سلیم چوہدری "پنجابی شاعری تیرھویں صدی ہجری وچ" ۱۹۷۳ء
۵۹۔ شوکت علی ملک "خواجہ غلام فرید دی شاعری وچ مقامی رنگ" ۱۹۷۳ء

فارسی

۶۰۔ عثمان صدیقی "مظہر جانِ جاناں اور اُن کی فارسی شاعری" ۱۹۶۰ء
۶۱۔ حفیظ الرحمان "غلام ہمدانی مصحفی کی فارسی شاعری" ۱۹۶۰ء
۶۲۔ خواجہ عبدالحمید یزدانی "خواجہ میر درد اور اُن کی فارسی شاعری" ۱۹۶۱ء

مقالات ایم۔فل اُردو (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

۱۔ عارف محمود (عارف ثاقب) "انجمن پنجاب کے مشاعروں کی تدوین" ۱۹۹۳ء
۲۔ محمد صابر رضا (اسلام آباد) "ڈاکٹر سید عبداللہ بطور محقق" ۱۹۹۳ء
۳۔ طارق جاوید جنجوعہ (گوجرانوالہ) "سودا اور حاتم کی غزل کا تقابلی جائزہ" ۱۹۹۳ء
۴۔ محمد اکرم سعید (شیخوپورہ) "ارشد میر.... حیات و فن" ۱۹۹۷ء
۵۔ عبدالرحیم (قصور) "حیات غالب از شیخ محمد اکرام... حواشی و تعلیقات" ۲۰۰۱ء
۶۔ میرزا عبدالقدوس (فیصل آباد) "سید مرتضیٰ حسین... فاضل لکھنوی۔ احوال و آثار" ۲۰۰۱ء

مقالات ایم۔فل اقبالیات (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

۱۔ محمد بشیر چوہدری "علامہ اقبال کی مرتبہ نصابی کتب۔ ایک جائزہ" ۱۹۹۳ء
۲۔ گلشن طارق "فروغِ اُردو کے سلسلے میں اقبال کی خدمات کا تحقیقی جائزہ" ۱۹۹۸ء

مقالات پی۔ایچ۔ڈی اقبالیات (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

۱۔ محمد بشیر چوہدری "پنجابی میں اقبال شناسی کی روایت" ۲۰۰۳ء

مشربِ محبت

طفیل ہوشیارپوری

اے ادیبِ بے بدل اے شاعرِ شیریں بیاں
زندگی بھر تو نے کی ہے خدمتِ اُردو زباں

ہے مُسلّم انفرادیت تری تحریر کی
معترف ہے تیرے اسلوبِ نگارش کا جہاں

آئنہ جذباتِ پاکیزہ کا ہے تیری غزل
نظم تیری عصرِ نو کے مسئلوں کی ترجماں

جاں نواز آہنگ تیرا' دل نشیں لہجہ تیرا
ہر کسی شاعر کو فطرت سے ودیعت ہے کہاں

طالبانِ فکروفن کرتے ہیں تجھ سے کسبِ نُور
تو زمینِ علم کا ہے درحقیقت آسماں

ناز ہے تنقید کے فن کو تری تنقید پر
دشمنوں سے داد لیتی ہیں تری سچائیاں

تُو ستائش سے گریزاں تو صلے سے بے نیاز
اس حقیقت کا ہے شاہد حلقۂ دانشوراں

آسمانوں سے پرے تیرے تجسّس کی نظر
تیری تحقیقِ ادب کا سلسلہ ہے بے کراں

تیرا مشرب ہے محبت تیرا مسلک ہے خلوص
تیری اک اک بات سے علم وشرافت ہے عیاں

اَن گنت اردُو ادب پر تیرے احسانات ہیں
ترجمانِ زندگی سب تیری تخلیقات ہیں

حافظ لدھیانوی

ہے "محفل" کی اشاعت آئنہ حُسنِ عقیدت کا
کیا ہے اعتراف اہلِ ادب نے تیری خدمت کا

دلوں کی دھڑکنیں ہیں نذر تیری رنگِ "محفل" میں
چمکتے ہیں نقوشِ پا ترے شاداب منزل میں

ترے حُسنِ ادب میں عکس ہے جہد و دیانت کا
ترے اسلوبِ دلکش کا' ترے رنگِ بلاغت کا

اَدب کی منزلوں میں ہر قدم تیرا حوالہ ہے
ادب کو تُو نے روحِ عصر کے سانچے میں ڈھالا ہے

تری تخلیق میں تحقیق کی خوشبو نظر آئی
مقالاتِ حسیں سے تُو نے بخشی اس کو رعنائی

تری گفتار میں علم و ادب کی چاشنی دیکھی
ہر اک تصنیف میں فکر و نظر کی تازگی دیکھی

نظر کو روشنی دیتا ہے اندازِ سخن تیرا
نئی راہیں سجھاتا ہے ادب کی علم و فن تیرا

تری تحریر سے گلشن ادب کا جگمگاتا ہے
نگاہِ شوق کو شادابیِ منزل دکھاتا ہے

زمانہ معترف ہے تیرے افکارِ درخشاں کا
نظر آیا اُجالا جن میں تیرے سوزِ پنہاں کا

پیامِ سرخوشی دیتا ہے تیرا رنگِ دلداری
لُبھاتا ہے دلوں کو تیرا آئینِ وفاداری

رہے تا حشر اقلیمِ سخن میں تیری دارائی
یونہی قائم رہے حافظ ادب کی بزم آرائی

اسرار سہاروی

یاد آئی ہے کس کی انجانی
ہے قلم مائلِ گل افشانی

ہے تخیل بھی پُر بہار اس دم
طرزِ ابلاغ میں دُر افشانی

یاد آئے ہیں ڈاکٹر صاحب
دیکھئے شوق کی قلم رانی

ڈاکٹر ہیں وحید انشا میں
ہیں تکلم میں اپنے لاثانی

جانِ علم و ہنر پہ واری ہے
وقفِ ملت ہے چاک دامانی

علم میں صاحبِ بصیرت ہیں
فن کی خدمت ہے ان کی لافانی

شعر و انشا میں معتبر ان کے
طرزِ تحریر ہے زر افشانی

ان کو تنقید میں مہارت ہے
ذوقِ تحقیق ان کا لاثانی!

ہے تخیل میں قوتِ پرواز
جذبۂ و فکر میں ہے تابانی

ہے عبارت رواں دواں ان کی
جیسے دریا کا ہو رواں پانی

فن میں تخلیق دیدنی ان کی
جذبۂ و فکر میں درخشانی

سوچ میں ان کی وسعتیں پنہاں
ان کی قدر میں متاعِ انسانی

ہیں شرافت کے قدر داں لیکن
خودستائی کے دشمنِ جانی

زندگی پُروقار ہے اُن کی
دُور رہتی ہے ان سے نادانی

ان کا کردار بھی مثالی ہے
دیدنی ان کے دل کی تابانی

جاہ و منصب سے بے نیازی ہے
دل ہے عشقِ وطن کا زندانی

خوش مزاجی میں اپنی یکتا ہیں
غم کی صورت بھی نہ پہچانی

سادگی دل سے ہے عزیز انہیں
شوقِ بے جا نظر میں ہے فانی

منہ لگایا کبھی نہ دولت کو
غم کی دولت ہوئی ہے ارزانی

یاالٰہی ہو ان کی عمر دراز
گرچہ دُنیا ہے آخرش فانی

ہم نے اسرار یہ دُعا کی ہے
ہو قبولیت بھی اس کو ارزانی

مطلع ثانی

شعر نازل ہوئے ہیں تدریجاً
عرض کرتا ہوں مطلعِ ثانی

یاد میں ان کی یہ گراں جانی
ہے قلم مائلِ ثنا خوانی

نثر میں ہیں مثیلِ نعمانی
نظم میں ہیں عدیلِ خاقانی

ہر نگارش محافظِ عصمت
ہر عبارت حریفِ عُریانی

ان کو زیبا ہے وہ اگر یہ کہیں
علم و حکمت میں "اعظم ثانی"

نکتہ داں ہیں رموزِ فطرت کے
ان کو حاصل ہے لُطفِ سبحانی

کیف پرور ہے شاعری اُن کی
قابلِ رشک ہے سخن رانی

فارسی میں کمال حاصل ہے
معترف ان کے ہیں بدخشانی

دوستوں کے ہیں جانثار بہت
ظالموں کے ہیں دشمنِ جانی

بزم میں قہقہہ فروشی ہے
رزم میں رسمِ آتش فشانی

ان کا ادراک رفعتوں کا امیں
اوج پر ہے شعورِ انسانی

پاکبازی کا یہ کرشمہ ہے
دُور رہتا ہے مکرِ شیطانی

اتنا کافی ہے بس کرو اسرارؔ
کیوں طبیعت ہوئی ہے دیوانی

☆

خوف زدہ غالب
اور
عصری صورت حال

ڈاکٹر وحید قریشی

غالب کی ذہنی زندگی اور حقیقی زندگی کے درمیان فاصلے تھے۔ ان کا شخصی ماحول ایک امیرزادے کا تھا۔ ابتدائی ازدواجت کے ساتھ ساتھ احساسِ تنہی اور چھپا ہوا خوف دونوں اونچے سُروں میں بات کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان حالات میں وہ ایک بہت اونچا آئیڈیل تراشنے پر مجبور ہیں۔ اس آئیڈیل کا ظاہری خاکہ جاگیردار طبقے کے معیاروں کے مطابق ہے۔ غالب ذہنا اسی جاگیردار طبقے کے فرد تھے۔ ان کی آرزوؤں نے ایک مثالی دُنیا بنالی تھی جسے اپنی ذات کے گرد بنائے رکھنے کا شوق انھیں طرح طرح کے نقوش بنانے پر مجبور کرتا تھا۔ انھیں کئی جتن کرنے پڑتے تھے۔ اپنے جد اعلیٰ کی عالی نسبی کے بار بار ذکر سے دراصل وہ اپنے آپ کو یہ یاد کرانے کی سعی کرتے تھے کہ وہ حاکم نسل سے ہیں۔ برتری کے خیال سے جو فی الاصل احساسِ کمتری ہی ہے وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کو حقیقت میں بدلنے کے لیے مغلیہ شان و شوکت کو گھر پر طاری کرنے کے لیے قرض کا سہارا لیتے۔ قطع نظر اس کے کہ غالب کے گھریلو اخراجات اس عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے عمر بھر خوف نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سبب شاید یہ تھا کہ ابتدا میں غالب کو ننھیال کے ہاں رحم و کرم پر پلنا پڑا اور دیگر فرد خاندان کے مقابلے میں کم حیثیتی کا آسیب ان کو ڈستا رہا۔ اور غالب کا اپنے بارے میں رویہ زیادہ اہم ہو گیا۔ وہ عرفی کی طرح اپنی شاعری میں بار بار اپنا ذکر کرنے لگے۔ ابتدا میں بیدل لیکن بعد میں عرفی غالب کا پسندیدہ شاعر تھا۔ شاعری میں محبوب کی بجائے اپنی ذات اہم ہوگئی۔ مولانا حالی کا کہنا ہے کہ غالب عام راستے سے ہٹ کر چلتے تھے۔ انھوں نے وہ شعری اسلوب وضع کیا جس کا محرک قوی ظاہر ذہنی ناآسودگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب کا شعری سرمایہ اسی ذہنی ناآسودگی کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے۔ زود حسی غالب کے ہاں یہ حالت زیادہ شدید و حزن بھی ہو جاتی ہے۔ جذباتی زندگی کا مسلسل مدّ و جزر غالب کو بےقرار رکھتا ہے۔ اس کی شدید ترین شکل وہ ہے جب وہ اپنے ناقدین کے خلاف ہر سطح کی گفتگو کرتے ہیں۔ معرکہ کلکتہ سے لے کر برہانِ قاطع کی بحث تک ایک جذباتی ردعمل پھیلا ہوا ہے۔

ذاتی محرومیاں کس حد تک اس آشفتہ بیانی کا باعث ہیں؟ ناآسودگی کا یہ حقیقی اظہار غالب کی جذباتی اور جنسی محرومیوں کا پرتو سمجھا جائے تو زندگی کو عصری حوالے سے دیکھنا ضروری ہوگا۔ کلامِ غالب میں سیاہ اور سرخ رنگوں کا بکثرت استعمال ان کی جنسی ناآسودگی کا بالواسطہ اظہار ہی تو ہے۔ بچپن کی شادی، بیوی کے مزاج کا عمومی طرزِ عمل، اولاد سے محرومی کے پے در پے صدمات اور گھر دامادی سے فرار کی جذباتی نوعیت واضح ہے۔ یہ حالات کس حد تک حقیقی تھے؟ اور کہاں تک غالب کے ذاتی اضطراب کا رنگ اس میں شامل تھا جو انھیں مبالغوں کی حدوں تک لے گیا؟ اس کی نشاندہی ممکن نہیں۔ غورطلب بات یہی ہے کہ غالب کی داخلی ہلچل جب خارج میں آئی تو مبالغے کا عنصر ذاتی ردعمل کے طور پر رہ گیا۔ انھیں عمر بھر یہ ملال رہا کہ زندگی میں ان کی مناسب قدر و منزلت نہیں ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد ان کی شہرت کی نوبت آئے گی حالانکہ غالب کا شمار اپنے عہد کے اہم شعرا میں ہوتا تھا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ شہرت کا معیار وہ نہ تھا جس کے غالب خواہش مند تھے۔ انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے یہی ثابت کیا کہ وہ مظلوم ہیں اور ان کی عظمت کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ ناآسودگی کا مرکزی نقطہ یہی احساس ہے جس نے انھیں داخلی اضطراب میں مبتلا رکھا۔ ان کی سوچ کا یہ دھارا ماحول سے بھی منسلک ہے۔ مغل حکمرانی سے روبہ زوال تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی شان و شوکت جو شعرا نے بیان کی اور وہ جو تاریخ بتاتی ہے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصل زندگی اور زندگی کے بارے میں آئیڈیل پسندی کے مابین فاصلوں کا احساس اب ہونا تاریخ کو آمنے سامنے رکھ کر ہی ممکن ہے۔ لال قلعے کی ساختہ شان اور عصری حالت میں فرق تھا۔ خلعتوں کی تو عوض بجا لیکن معیارِ خلعت گر گیا تھا۔ ظلِ الٰہی کا اقتدار از دہلی تا پالم، انگریز جسے وظیفہ خوار کہتے تھے۔ شہنشاہ کی نظر میں وہ خراج تھا۔ یہ دیکھ کر تو قدرت کی ستم ظریفی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ شعرائے عصر ساختہ مثالی زندگی اور حالیہ اصل زندگی کے درمیان تخیل کی مدد سے تیرتے نظر آتے ہیں۔ غالب اپنے معاصرین کی نسبت زیادہ حساس تھے اسلیے ان کے ہاں شاعری کا یہ مظاہر زیادہ بلند ہے جس میں غم کی لہر بھی ہے۔ غالب نواب تو نہ تھے لیکن اپنے آپ کو عمر بھر نواب ہی سمجھتے رہے۔ ان کا گھرانا معمولی تھا لیکن آئیڈیل سسرالی تھا۔ غالب کے شاہانہ اخراجات ان کے وسائل سے زیادہ تھے۔ اب اس رویے کی توجیہہ ظاہر یہی ہو سکتی ہے کہ غالب کے اصل حقائق اور آئیڈیل کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل جدید مغربی اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی پالیسی کے سبب ابھی بڑی بڑی تبدیلیاں تو نہیں آئی تھیں اور نہ ایک فعال طبقے کے طور پر درمیانی طبقے کا الگ سے ظہور ہی ہوا تھا۔ تہذیبی سطح پر تبدیلی کا احساس بھی غالب کو تھا۔ انھوں نے مغربی تمدن کی برتری کو بھ

نظرِ استحسان دیکھا اگرچہ اس طرح نہیں جس طرح سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے دیکھا۔ شعر و ادب میں وسعت کی خواہش تو غالب میں ہے لیکن موضوعات میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ملتی۔ دوسرے یہاں کی زندگی کا آخری دور تھا جب ذاتی غم و الم میں وہ ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ غالب کا انتقال (عصری شہادتوں کے مطابق) حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوا جس کا بنیادی سبب ذیابیطس کا مرض تھا۔ وہ بد پرہیز بھی تھے۔ آموں کے بکثرت استعمال نے ان کے ہاں شکر اور نتیجتاً فشارِ خون کا درجہ بلند کر رکھا تھا۔ ان کی قوتِ مدافعت اوائلِ عمر کے آغاز ہی میں ختم ہو چکی تھی اس لیے غالب کی زندگی کے آخری ایام کئی امراض کی بنا پر بیرونی زندگی سے بہت حد تک کنارہ کشی اور ذاتی افکار میں گم ہو جانے پر تھی۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی پر غالب کڑھتے تھے اور بعض اوقات ان کی جھلاہٹ خودکشی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اب وہ اپنی معنوی امارت پر استہزائی جملے بازی بھی کرنے لگے۔ اس اعصابی انحطاط میں ممکن ہے فکر کی خرابی کا بھی حصہ ہو لیکن اس کے بیرونی شواہد نہیں ملتے۔ وہ اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر رہ گئے۔ یہی خوف زدہ شخص کا دفاعی حربہ ہے۔

جب برطانوی اقتدار کی آنکھیں کھل رہی تھیں غالب کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ تاجِ برطانیہ کو اقتدار کی منتقلی ان کی زندگی کے آخری ایام میں ہوئی لیکن پوری زندگی تو قرونِ وسطیٰ ہی میں بسر ہو گئی۔ غالب کا شعور جدید عہد کا احساس تو رکھتا تھا لیکن نئے طرزِ احساس کے باوجود غالب قرونِ وسطیٰ کے تمدنی افکار کے نمائندے تھے۔ ان کی شاعری قدیم تمدنی زندگی کی عکاس ہے۔ انسان کا جو پیکر غالب کے ہاں ملتا ہے اس میں ان کے ردِ عمل کی وجہ سے ایک نرالا پن ہے، ایک احتجاج ہے، تازگی ہے، جرأت ہے۔ غالب نے زندگی کی اس دوامی کے دونوں سروں کو جوڑ کر دیکھا اس لیے ان کا لہجہ اپنا اور نیا ہی نہیں بلکہ اس میں تجربے کی تہہ داری ہے۔

غالب نے شعری روایت کو مقامیت سے نکال کر دوبارہ وسط ایشیائی تہذیبی شعور سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی۔ ان کا شعری انسان تمدنی لحاظ سے ایران اور وسط ایشیا کا باشندہ ہے۔ ماضی قریب کی بجائے ماضی بعید میں لگائی گئی یہ جست محض بغاوت کا اظہار نہیں، یہ اپنے آپ کو زمانی لحاظ سے دوسری دنیا میں لے جانے کا عمل بھی ہے، یہ ایک تخیلی زقند ہے، مادی زندگی سے نکل کر تخیل کی دنیا میں بس جانے کا عمل ہے۔ ٹھوس مادی حقائق سے گریز کی صورت یہ بھی تو ہے کہ انسان ذہنی زندگی بسر کرنے لگے۔ اسی دنیا میں غالب کے لیے اپنی انا کی بہتر طور پر برداشت ممکن تھی نیز فکری توانائی زیادہ صحت مندی سے سرگرمِ سفر رہ سکتی تھی۔ ماضی قریب سے ماضی بعید کا جو ذہنی سفر غالب کے لیے تازگی کا پیغام لایا اس شعور آگہی میں یہ احساس بھی نمایاں ہے کہ وہ ایران کی زبان میں یعنی اپنے آبا کی زبان میں شاعری کر رہے ہیں اور گردو پیش کے تہذیبی اور تمدنی اثرات سے آزاد ہیں۔ غالب ہندی فارسی شعری روایت کے مخالف تھے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ عمر بھر اس سے دامن بھی نہ بچا سکے۔ وہ ہندی فارسی کو شعرا کو حقیر جانتے تھے۔ تخیلی سطح پر ایرانی اساتذہ کی ستائش کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں دساتیر خالص فارسی نثر کی نمائندہ کتاب ہے لیکن خود غالب کی نثر ابوالفضل کے نثری اسلوب سے الگ نہیں۔ لسانی اعتبار سے غالب ان سب خرابیوں کے پیروکار تھے جو ہندی نژاد ادبا کی فارسی میں پائی جاتی تھیں۔ انہیں اپنا تشخص اُردو شاعری میں نہیں فارسی شاعری ہی میں ملتا ہے اور وہ اسی پر ناز کرتے ہیں۔ حالات سے گریز کی یہ صورت غالب کو زندگی کے بعض پہلوؤں سے الگ نہیں کرتی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کو دیکھ کر وہ دلی کی تباہی کا نوحہ کرتے ہیں اور اس صورتِ حال میں خوف اور دہشت ان کے ہاں بڑی نمایاں ہے۔ خوف زدہ غالب جب زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے تو خوف و ہراس کی ایک لہر اس کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ یہی خوف غالب کو بار بار تخیل کی زقند بھرنے پر مجبور کرتا رہا اور آخری زندگی میں اس میں خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ ناکامی اور ہزیمت کا احساس بھی شامل ہو گیا۔ زندگی سے بیزاری اور ماحول سے عدم اطمینان میں ان کی گرتی ہوئی صحت کا دخل بھی ہو گا۔ غالب کی زندگی کی تلخیوں میں اضافہ ہو گیا اور وہ اپنی ناکامی پر بعض اوقات جھلانے بھی لگے۔

ذہنی دفاعی دیوار کی کمزوری کا احساس انہیں بار بار تخیلی فرار پر مجبور کرتا ہے ایسے میں عصری صورتِ حال کا نوحہ کچھ زیادہ ہی بلند ہوتا چلا گیا۔ جس انا کے حصار میں وہ عمر بھر عافیت ڈھونڈتے اور حاصل کرتے رہے آخر میں یہ گوشۂ عافیت بھی غالب کو سکون اور اطمینان عطا نہ کر سکا۔ غالب بکھر کر رہ گئے۔ مالی مشکلات نے انہیں بے دم کر دیا اور وہ حصولِ زر کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ انداز اختیار کرنے پر بھی مجبور ہوئے۔ غالب نے تخیل کے جو تاج محل بنائے آخری ایام میں مسمار ہو کر رہ گئے۔ اس کا اظہار خطوط میں ہوا ہے۔

اندر سے ٹوٹ کر رہ جانے کا یہ عمل غالب کی زندگی کا آخری اندوہناک باب ہے۔ وہ کرب کے اسیر ہیں اور احساسِ گناہ بڑھ گیا ہے۔ اس کی توجیہہ غالب کی شخصیت کے بنیادی عناصر کے حوالے ہی سے ممکن ہے۔ جس میں انا کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ باقی رہا بیک وقت انگریز کی توصیف اور دلی کی تباہی پر افسوس.... عقلی طور پر وہ انگریز کے حامی اور جذباتی طور پر قدیم معاشرتی اقدار کے نام لیوا تھے۔ یہ عقلی اور جذباتی آویزش ان کے دوہرے رویے کا سبب ہے جس میں انگریز کا ڈر اور خوف بھی تھا اور صدقِ دل سے وہ ابو ظفر بہادر کے شاگرد بھی تھے۔ اس سے ان کے ہاں غم کا عنصر زیادہ شدید ہو گیا، جس سے شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ بھی شدت اختیار کر گئی۔ کسی حد تک پُرسکون رویے صرف مذہبی واردات کے حوالے سے غالب کے ہاں آئے ہیں لیکن ان کا دائرہ شخصیت کا صرف محدود حصہ ہے۔ ان کی ذات کرب سے زیادہ متاثر ہے۔

براہِ راست

[illegible] "چہارسُو" [illegible]
[illegible]
[illegible] عصر کی انتہائی بلند قامت [illegible] نقاد، شاعر اور کالم نگار
محترم **ڈاکٹر وحید قریشی** صاحب کی خدمت میں [illegible] پیش کریں [illegible]
[illegible] قارئین "چہارسُو" [illegible] "چہارسُو" [illegible]
[illegible]
ہمارے دلوں میں **ڈاکٹر وحید قریشی** صاحب کی بہت
احترام و عقیدت [illegible] شمارے کی
ترتیب [illegible] ڈاکٹر صاحب [illegible] کا
[illegible] **ڈاکٹر وحید قریشی** صاحب کی صحت [illegible] اور درازی
عمر کی دعا [illegible]
ڈاکٹر صاحب [illegible]

گلزار جاوید

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ کی اجازت سے گفتگو کا سلسلہ بچپن سے شروع کرتے ہیں!

☆☆ گلزار میاں! برِصغیر کے غریب اور متوسط خاندان کے بچوں کی طرح میرا بچپن بھی اُس وقت کے ماحول کے مطابق گُلی ڈنڈا، پتنگ بازی، تیر بازی، کبڈی، فٹبال اور سائیکل ریس وغیرہ کے اشغال کرتے گزرا ہے۔

☆ کچھ نوجوانی اور اس کی وارداتوں کی بابت بھی بتائیے؟

☆☆ میاں جگ بیتیں نہ کرو، سنجیدہ گفتگو میں نوعمری اور نوجوانی کی باتیں کہاں زیب دیا کرتی ہیں۔ ویسے بھی آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں کہ میری نوجوانی آپ اور دیگر خوبصورت لوگوں کی طرح کچھ زیادہ رنگین نہ تھی۔ فقط ایک عشق وہ بھی یکطرفہ کے علاوہ کوئی سنسنی خیز واقعہ میرے حافظے میں نہیں ہے البتہ تعلیم کے ساتھ مصوری اور خطاطی کے شوق بھی کافی دن ساتھ رہے۔

☆ غالب جیسا مستند اور فلسفی شاعر آبا کے پیشہ سپاہ گری پہ فخر کرتا ہے جبکہ آپ نے آبا کے اس پیشے کو کلی طور پر مسترد کر دیا؟

☆☆ میاں یہ سب کیا دھرا محمد حسین آزاد کا ہے جن کی کتابیں سکول کے زمانے سے میرے مطالعے میں تھیں مگر نہ میں نے نو آٹھویں اردو ہی پڑھی تھی۔ محمد حسین آزاد کے اسلوب نگارش نے کچھ اس طرح دل و دماغ کو گرفت میں لیا کہ اردو ادب کے علاوہ کسی اور طرف طبیعت راغب ہی نہ ہوئی حالانکہ میرے پردادا تحصیلدار، دادا اور والد پولیس افسر تھے۔ تایا، چچا، ماموں وغیرہ بھی پولیس کی ملازمت میں تھے۔

☆ سنا ہے! آپ کے والد صاحب سخت گیر انسان تھے پھر وہ آپ کے آگے کیونکر بے بس ہو گئے؟

☆☆ یہ بھی طویل داستان ہے میں چپکے چپکے اپنی راہ پر گامزن تھا والد صاحب اپنی جگہ پلاننگ کر رہے تھے۔ میٹرک میں ڈرائنگ کے ساتھ اسلامیہ ہائی سکول سے، پنجاب میں میں نے ٹاپ کیا تھا میرے کلاس فیلوز میں نمایاں ترین جسٹس جاوید اقبال، ڈاکٹر عنایت اللہ (عطیہ عنایت اللہ کے شوہر) تھے۔ والد صاحب کی خواہش پر انجینئر بننے کی غرض سے mathematic کے ساتھ ایف اے کیا۔ بی اے میں والد صاحب کی خواہش کے باوجود A.B کورس لے کر چھوڑ دیا۔ بی اے کے بعد والد صاحب نے لاء کالج میں داخلے کے لئے فیس دی تو میں اپنی مرضی سے M.A.O کالج میں فارسی میں ایم اے کرنے کے لئے داخل ہو گیا۔

☆ آپ کے اس عمل پر والد صاحب کا ردِعمل یقیناً شدید ہوا ہوگا؟

☆☆ وقت کے ساتھ والد کا رویہ اُس قدر سخت نہ رہا تھا جس قدر کم عمری یا نوجوانی میں ہوا کرتا تھا۔ والد صاحب کی ناراضگی پر میں نے اُن سے کہا کہ میں وہ مضمون پڑھنا چاہتا ہوں جس میں ٹاپ کروں اور کوئی بہتر پوزیشن حاصل کر سکوں۔ میرے استدلال پر والد صاحب خاموش ہو گئے۔

☆ سنا ہے! دورانِ تعلیم آپ اپنے ہم جماعتوں کو باقاعدہ پڑھانے بھی لگے تھے؟

☆☆ آپ کی اطلاعات کافی حد تک درست ہیں۔ میرے شوق اور انہماک کے باعث بارہا مطلوبہ پروفیسر کی عدم موجودگی میں، میں نے بطور ریسرچ سکالر بیس برس کی عمر میں نہ صرف ایم اے فارسی بلکہ ایم اے اردو کو بھی تنقید وغیرہ پڑھائی ہے۔ میرے اُس وقت کے طلبا میں نمایاں تھے مظفر، یوسف ظفر، مرزا محمد منور، الف۔ دال۔ نسیم اور انجم الطاف کے نام حافظے میں محفوظ رہ سکے ہیں۔ میری ان صلاحیتوں اور خدمات کے باعث میرے کلاس فیلوز اور طلبا مجھے اُسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب کہنے لگے تھے۔

☆ آپ نے ایم اے ہسٹری صرف ایک سال میں کس طرح کیا تھا؟

☆☆ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیرِ نگرانی میں نے فارسی کے ثانی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی تھی جس کے بعد ایرانی پروفیسر عباس شستری کے توسط سے ایران میں سکالرشپ آفر ہوئی مگر والد صاحب سے

ایران جانے کی اجازت نہ مل سکی۔ شروع میں میری خواہش اورینٹل کالج میں پڑھانے کی تھی مگر کسی نے شعبہ اردو میں آنے نہیں دیا چنانچہ میں نے موقع غنیمت جان کر ایم اے ہسٹری میں اپلائی کیا تو فارسی کا آدمی کہہ کر ٹرخا دیا گیا۔ فارسی کی آسامی نکلی تو ہسٹری کا بندہ کہہ کر ٹرخانے کی کوشش کی گئی۔ ایم اے اردو، ایم اے فارسی، ایم اے ہسٹری کو بڑی مشکل سے لیکچرار کی جاب مل سکی اور میں چھ سال [illegible] میں ہسٹری پڑھاتا رہا۔

★ آپ کی زبان دانی، ہمہ جہتی اور شستہ مزاجی کے بڑے چرچے ہیں اور بجا طور پر ہیں۔ کسی ایک شخص میں اس قدر اور بے پناہ صفات کا یکجا ہونا عجوبے سے کم نہیں!

★★ دیکھیے جناب! جس طرح دھوپ چھاؤں، سردی گرمی، ٹھنڈا گرم اور میٹھے نمکین کی لذت اور تاثیر الگ الگ اور جدا جدا ہوا کرتی ہیں اسی طرح شخصیات کی محبت اور تربیت بھی مختلف اور جداگانہ اثرات میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ اردو زبان کی بابت میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ محمد حسین آزاد اور ان کی تخلیقات کی عطا ہے۔ فارسی میں نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور عباس شستری صاحب سے سیکھی۔ فرنچ مظفر علی سید صاحب سے پڑھی۔ جرمن ڈاکٹر براؤن سے پڑھی جو میں بھول چکا ہوں۔ گورمکھی اور پنجابی کے پروفیسر کا نام حافظہ میں نہیں آ رہا بس اتفاق سے کرتے تھے سلمان۔

★ دیگر کارہائے نمایاں مثلاً تحقیق، تنقید، تدریس وغیرہ کا ماخذ کیا ہے؟

★★ تدریس پہلے شوق تھا پھر مجبوری بن گئی تحقیق کی طرف میرا رجحان اپنے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر اقبال صاحب کی توجہ، رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے باعث ہوا۔ تنقید کا شوق سید عابد علی عابد صاحب کی رہنمائی کا نتیجہ ہے۔

★ شاعری کی ابتدا اور انتہا کی بابت ارشاد فرمائیے؟

★★ میری شاعری کا پہلا دور ۱۹۴۳ء سے شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب حفیظ اور احسان دانش سے میری دوستی تھی اور میں انہی کے رنگ میں شعر کہتا تھا یہ دور ۱۹۴۷ء تک رہا۔ اس دوران انگریزی کے شاعروں اور نقادوں کو پڑھا جس کا اثر میری شاعری پر ہوا چنانچہ حلقہ ارباب ذوق اور فری ورس وغیرہ سے ہوتا ہوا میں جدیدیت کی طرف آ گیا۔ اس زمانہ میں اردو، فارسی اور پنجابی زبان میں شاعری کرتا رہا ۱۹۶۷ء ہی میں "سجھ جاں" کے عنوان سے سنگ میل نے میری شاعری کا انتخاب شائع کیا۔

★ اس زمانے میں آپ کی شاعری کے موضوعات عموماً کیا ہوا کرتے تھے؟

★★ کئی موضوعات شامل تھے۔ مثلاً جنسی شاعری، سیاسی شاعری، سماجی شاعری، عشقیہ شاعری البتہ فلسفیانہ رنگ زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ اسی دوران میرا رجحان تحقیق اور تنقید کی جانب زیادہ ہو گیا تو میں شاعری سے دس سال کٹا رہا۔ تیسرا دور میری شاعری کا ۱۹۷۰ء سے شروع ہوتا ہے جس میں کلاسیکی کی طرف رجحان زیادہ رہا۔ اس دور کی شاعری کا مجموعہ "الواح" کے نام سے ریاض مجید نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ جدیدیت کے دور کی شاعری کچھ اس طرح کی تھی۔

یہ رات وہ ہے خوشی بھی ہجوم غم بھی ہے
کسی دلہن کے لئے جس طرح بجا رات کی رات

"الواح" سے ایک دوہا آپ اور آپ کے قارئین کی نذر ہے

چاند کا تنکھی سو گیا لمبی چادر تان
گلیاں شہر لاہور کی سونی اور سنسان

"الواح" کے بعد "ڈھلتی عمر کے نوحے" ۱۹۹۷ء میں مکمل ہو گئی تھی مگر اشاعت اب ہوئی ہے۔ ایک شعر سنئے:

تمام عمر کی بیتابیاں لب آ کے مٹیں
سکون قلب کے غار حرا میں رہتا ہوں

علالت کے سبب نثر لکھنے پر قادر نہ ہونے کے باعث شاعری سے جی بہلاتا ہوں۔ اب تک چار مجموعے مکمل ہو چکے ہیں جنہیں خواجہ محمد ذکریا صاحب ترتیب دے کر جلد منظر عام پر لانے والے ہیں۔

★ یہ بات کہاں تک درست ہے کہ آپ شاعری کے ابتدائی ایام میں مشاعرے پڑھنے سے کتراتے تھے؟

★★ بچپن میں میں کافی دبلا پتلا ہوا کرتا تھا۔ کالج میں پہنچتے پہنچتے کافی فربہ ہو چکا تھا جس کے باعث مشاعروں میں جانے سے شرماتا تھا۔ بی اے کے دوران میں نے اپنے طور پر سائیکالوجی پڑھ کر اپنا احساس کمتری دور کیا اور بے تکلف مشاعروں میں جانے لگا۔

★ آج کی شاعری اور گزشتہ وقتوں کی شاعری کا موازنہ کبھی کیا ہے آپ نے؟

★★ آج کی شاعری میں زبان کے لحاظ سے بہت فرق پڑ گیا ہے۔ نئے نئے اوزان ٹوٹ گئے ہیں اس سے وسعت پیدا ہوئی ہے۔ نئے عروض اور نئے تجربات کئے جانا بہت ضروری ہیں البتہ آج کی شاعری کے موضوعات چھوٹے اور مسائل بڑے ہیں جن کی طرف اہل قلم کی نظر نہیں جا پا رہی۔

★ نثری نظم والے تو بہت پُرامید اور پر اعتماد دکھائی دے رہے ہیں!

★★ میرے خیال میں نثری نظم کی جڑیں ہمارے ادب میں اس طرح قائم نہ ہو سکی ہیں جس طرح وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔ میری نظر سے ابھی تک کوئی اعلیٰ درجے کا نثری نظم کا تخلیق کار نہیں گزرا۔

★ آپ کے خیال میں اس کے کیا اسباب ہیں؟

☆☆ اس کے کم از کم دو اسباب ہیں۔ نمبر ایک معاشرتی اور سیاسی انتشار نمبر دو شعر اور ادبا کا اخباری صحافت کی طرف رخ کر جانا۔

☆ آپ اردو شاعری کے حوالے سے کس قدر پُر اُمید ہیں؟

☆☆ مایوسی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ جس شاعری میں میر تقی، راشد، فیض، ناصر، مجید امجد، منیر نیازی، ظفر اقبال، اختر الایمان، انیس ناگی، شبنم رومانی، محمد اظہار الحق اور عدیل عقیل دستیاب ہوں اس شاعری کا مستقبل کیسے تاریک ہو سکتا ہے بشرطیکہ گردوپیش کا ماحول موافق و سازگار رہے۔

☆ اردو افسانے کی بابت ماضی، حال، مستقبل کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

☆☆ اردو افسانے کے باب میں پہلے بھی تسلی بخش کام ہوا ہے اور آج کل بھی عمدہ افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ منٹو، بیدی، اوپندر ناتھ اشک، کرشن، عصمت، قرۃ العین، بلونت سنگھ، جوگندر پال، انتظار حسین، احمد علی، انتظار، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، شمشاد احمد، مبین مرزا وغیرہ کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے عمدہ افسانے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ بس ذرا ترقی پسندی کے زیر اثر عصمت اور کرشن کچھ دنوں کے لئے اپنی راہ سے بھٹک گئے تھے جس کا نقصان بھی انہوں نے خود اٹھایا ہے۔ مجموعی طور پر میں اردو افسانے کو انگریزی اور یورپی ادب کے برابر رکھنے کا قائل ہوں۔

☆ تنقید کے باب میں کافی عدم اطمینان پایا جاتا ہے؟

☆☆ آپ کے خیال سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ ہمارے ہاں عملی تنقید تو بہت ہو رہی ہے نظری تنقید نہ ہونے کے برابر ہے سوائے ڈاکٹر وزیر آغا کے کسی تنقید نگار کی کوئی اعلیٰ تحریر میری نظر سے ان دنوں میں نہیں گذری البتہ میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ کا دل سے قائل ہوں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تاریخ ادب کا بھی معترف ہوں اور تبسم کاشمیری کو بھی اس ضمن میں اہمیت دیتا ہوں۔

☆ آپ نے جس قدر بھی تنقید لکھی اس کی بابت آپ کا اور احباب کا کہاں تک اطمینان ہے؟

☆☆ کوئی بھی ہوسے ہو انفرادی طور پر غیر جانبدار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا البتہ یہ کوشش ضرور کی جا سکتی ہے کہ مختلف نقطہ ہائے خیال کا غیر جانبداری سے تجزیہ کیا جائے کوشش یہ ہونا چاہئے کہ ذوق وسیع ہو اور آدمی بہ یک وقت غالب، اقبال، میر اور داغ کی تفہیم کر سکے اور اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کر سکے۔ میری تنقید امتزاجی تنقید ہے پہلے میں نفسیات سے متاثر تھا چنانچہ شبلی کی حیات معاشقہ جو میری پہلی تحریر ہے فرائڈ کے نقطۂ نظر سے تحریر کی۔ بعد میں سفر کرتے ہوئے یونگ تک پہنچا پھر ایک تبدیلی یہ آئی کہ تاریخ کے مطالعے کی وجہ سے میں ادب کو تاریخ کے پس منظر میں دیکھنے لگا۔ سماجی تجزیہ بھی کرتا ہوں اور شخصی بھی۔ شخصیت کے تجزیے میں نفسیات کا استعمال بھی کرتا ہوں لیکن میں فرائڈ، ایڈلر، میک ڈوگل سے یونگ تک چلا آیا ہوں۔ تحقیق کی طرف جانے کے باعث میری تنقید میں تاریخی حوالے زیادہ اُجاگر ہو گئے ہیں۔

☆ آج کل تحقیق کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ پی ایچ ڈی کی ریسرچ سے پہلے اور ریسرچ کے دوران میرا رجحان ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی رہنمائی میں مولوی شفیع کے بارے میں مضمون تحریر کرنے سے ہوا اس وقت تقریباً پاکستان کی آٹھ یونیورسٹیوں کے نصاب میں میرا تحقیقی کام شامل ہے اب تک میں نے میر حسن، فورٹ ولیم کالج، غالب، اقبال پر خصوصیت کے ساتھ کام کیا ہے۔

☆ ہمارے ایک سوال کے جواب میں آپ نے ابھی ادبی معیار برقرار نہ رہنے کا سبب اخباری صحافت کو ٹھہرایا ہے۔ پھر آپ کیونکر اخباری کالم نگاری کی طرف جا نکلے؟

☆☆ میاں ہماری کالم نگاری کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان نے مزاحیہ تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں ہمیں بھی شرکت کی دعوت دی گئی جس کے بعد ہمارے شاگرد رشید حسن رضوی نے مزاحیہ کالم لکھنے کی فرمائش کر دی۔ سو جناب "میر جملہ لاہوری" کے نام سے چار پانچ سال جنگ اخبار میں شوقیہ کالم نگاری کرتے رہے میرے اکثر کالم طنز و مزاح کی چاشنی سے پُر ہوا کرتے تھے جس کے باعث عوام و خواص میں پسندیدگی سے پڑھے جاتے تھے۔ پروین شاکر مرحومہ کے گھر بیٹے کی ولادت پر ہمارا یہ جملہ بہت مشہور ہوا "پروین شاکر آخر ایک ڈھنگ کی تخلیق پیش کرنے میں کامیاب ہو گئیں" ازاں بعد نواز شریف صاحب کی مہربانی سے اقبال اکیڈمی کی ملازمت ختم ہو گئی تو گھر کا چولہا گرم رکھنے کے لئے پھر سے کالم نگاری کا سہارا لینا پڑا۔

☆ آپ نے جس طور اپنی کالم نگاری کا جواز پیش کیا اُسے تسلیم نہ کرنا عقل کی تردید کے مترادف ہوگا۔ بچگانہ ادب کی طرف آپ کے جھکاؤ کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ میں نے ابتداء میں آپ سے عرض کیا ہے کہ محمد حسین آزاد کی کتابوں نے مجھے اردو زبان اور ادب کی طرف مائل کیا ہے آزاد کے اس جملے نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں بچوں کے لئے لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ "بچوں کے لئے لکھنے کے لئے بچہ بننا پڑتا ہے" چنانچہ میں نے جب بھی بچوں کے لئے کچھ تحریر کیا خود کو اُن کی سطح پر لا کر ہی تخلیق کیا ہے۔

☆ ہم اس کی تھوڑی سی تفصیل جاننا چاہیں گے؟

☆☆ "پاکستان ہسٹاریکل ریڈرز" میں صوفی عبدالعزیز صاحب، صوفی مجیب الٰہی صاحب اور محمد حفیظ صاحب کے ساتھ مل کر چھ کتابوں کا سلسلہ انگریزی زبان میں تحریر کیا ہے جو بچوں کے نصاب میں شامل ہے اس کے علاوہ پانچویں سے آٹھویں تک کے نصاب میں سید امتیاز علی تاج، مولانا غلام رسول مہر

اور اسحاق جلال پوری کے ساتھ مل کر فکشن، تنقید، تحریر، تالیف کی ہیں۔ اسی طرح میٹرک کی کتاب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب کے ساتھ مل کر تحریر اور ترتیب دی ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار کتابوں پر نظر ثانی بھی کر چکا ہوں۔

☆ سنا ہے ملازمت کے دوران آپ نے بڑے معرکے سر کئے ہیں اور بہت سوں کا پتہ پانی کیا ہے؟

☆☆ یہاں مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ میں تو خود پوری ملازمت کے دوران ظلم و ستم کا نشانہ بنتا رہا ہوں!

☆ مثلاً ذرا تفصیل سے بتایئے؟

☆☆ جس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر کی آسامی خالی تو میں نے اس کے لئے درخواست دی۔ مجھے لاہور میں جوائن کرانے کے بجائے کیمبل پور بھیج دیا گیا اور کیمبل پور کے پروفیسر کو لاہور بلا لیا گیا۔ میں نے جائن نہیں کیا۔ جب ہسٹری کی پوسٹ پر اپلائی کیا تو فیصل آباد کے پروفیسر کو لاہور بلا کر مجھے فیصل آباد جانے کو کہا گیا۔ میں نے پھر جائن نہیں کیا۔ میں نے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہی تو یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ اس فیکلٹی میں تمہارے پاس پہلے سے ایک ڈگری ہے لہٰذا میں نے "میر حسن اور ان کا زمانہ" پر تھیسس چھپوا کر ڈی۔ لٹ کی ڈگری لینا چاہی تو عبادت بریلوی صاحب نے یہ اعتراض کر دیا کہ سات ممتحن میں سے چار بیرونی اور تین اصل نگران میں سے وہ نے ڈی لٹ اور ایک نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینے کی سفارش کی ہے لہٰذا عبادت بریلوی صاحب نے متنازعہ معاملہ بنا کر ڈگری کھٹائی میں ڈال دی۔ سنڈیکیٹ میں جسٹس رحمان نے کہا کہ ایک ایم اے پر دوسرا ایم اے ہو سکتا ہے تو ایک پی۔ ایچ۔ ڈی پر دوسری پی۔ ایچ۔ ڈی کیوں نہیں ہو سکتی۔ اس طرح پنجاب یونیورسٹی نے مجھے دوسری پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کر دی۔ اسی دوران نذیر احمد ای سکالر نے کیمسٹری میں ڈی۔ ایس۔ سی کا تھیسس داخل کیا تو ان کا کیس چیلنج ہو گیا۔ انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی تو وہ عدالت میں چلے گئے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ ڈگری کا فیصلہ ممتحنوں کی رائے پر ہونا چاہئے لہٰذا انہیں ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگری دے دی گئی۔ ایک سال بعد حمید احمد خان کے فیصلے کی روشنی میں ڈی لٹ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کو مساوی ڈگری تسلیم کرنے یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی اندرونی ڈگری اور ڈی۔ لٹ پرائیویٹ کرنے کی اجازت کی روشنی میں مجھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری واپس لے کر ڈی۔ لٹ کی ڈگری دے دی گئی۔

☆ آپ کو انصاف کی فراہمی کے بعد یہ قصہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہو گا؟

☆☆ ارے صاحب ابھی کہاں ختم ہوا۔ جیسے ہی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی بنیاد پر اورینٹل کالج لاہور میں اردو کا لیکچرار لگا مجھے جبراً اوقاف ریسرچ سوسائٹی کو آرگنائز کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد وقار عظیم صاحب کو اپوائنٹ کرانے کی کوشش کی گئی چونکہ میں زیادہ کوالیفائیڈ اور زیادہ کتابوں کا مصنف تھا لہٰذا اوقاف کے محکمہ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی پوسٹ نکلوا کر مجھے وہاں بھیجنے کی کوشش کی گئی۔ میں دیال سنگھ پبلک لائبریری میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایس۔ ایم۔ اکرام کو خوش آمدید نہ کہنے پر اُن سے لڑائی ہو گئی اور یوں میں پھر واپس آ گیا۔ میری واپسی میں میری سینیارٹی کو زیادہ دخل تھا۔ عبادت بریلوی صاحب نے صدر شعبہ اردو کے طور پر مجھے ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر جائن نہ کرنے دیا۔ میں نے وائس چانسلر کے دفتر میں جا کر جائن کیا۔ اس کے بعد میری تنخواہ میں یہ کہہ کر خدشہ ڈالا گیا کہ میں جونیئر کلاس ون سے سینئر کلاس ون ہو گیا ہوں تو سینئر کلاس ون کی تنخواہ کیسے لے سکتا ہوں۔ دو سال تک بغیر تنخواہ کے کام کیا۔ میری طرح کے چار کیس اور بھی تھے جو تنخواہ لے رہے تھے میں نے ان کے خلاف درخواست دائر کر دی۔ ان چاروں کی تنخواہیں بھی رک گئیں۔ بعد میں محکمے کے اعلیٰ حکام کی مدد سے یہ مسئلہ حل ہوا۔

☆ پیپلز پارٹی کی حکومت آنے کے بعد آپ کو کس سبب مزید سخت حالات کا سامنا رہا؟

☆☆ وقار عظیم صاحب کو پروفیسر بنانے کے لئے ایک پوسٹ کی تشہیر ہوئی۔ وقار عظیم کے دوستوں کو بلوا کر ان کے حق میں رائے لے لی گئی اور وہ پروفیسر مقرر کر دیئے گئے۔ دو سال بعد وہ ریٹائر ہوئے تو یہی پوسٹ پھر ایڈورٹائز ہوئی جس پر میں نے اپلائی کیا۔ عبادت صاحب نے یونیورسٹی کو لکھا کہ مجھے پروفیسر کی کوئی ضرورت نہیں لہٰذا اس پوسٹ کو ختم کر دیا جائے مگر حکومت نے وہ پوسٹ ختم نہ کی۔ پھر یہ موقف اختیار کیا کہ اس آسامی کو غالب شناسی کے پروفیسر کی آسامی بنایا جائے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ چالبازی سے میرا نام تین سو تیرہ کی فہرست میں ڈال دیا گیا۔ معراج خالد صاحب کی ذاتی دلچسپی سے میری ملازمت تو بچ گئی البتہ نواب صادق حسین قریشی کے زمانے میں مجھے یونیورسٹی سے نکلوانے کی پھر کوشش کی گئی۔ میں کسی نہ کسی طور پھر بچ گیا۔ کھر صاحب کے دور میں ڈاکٹر اجمل نے بطور وائس چانسلر میری برخواستی کا حکم جاری کر دیا مگر کھر اور بھٹو صاحب کے جھگڑے کی وجہ سے اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ حنیف رامے کے دور میں مجھ پر گولی چلوائی گئی۔ مجھے پیپلز پارٹی کا مخالف بنا کر میری نوکری مشکل رکھی گئی مگر حنیف رامے کی ذاتی دلچسپی نے مجھے بحال کرایا۔ میرے عزیز! میں وہ بدنصیب ہوں کہ میری کوئی بھی ترقی لڑائی کے بغیر نہ ہوئی۔

☆ اس کے بعد آپ یونیورسٹی کے لئے ناگزیر کس طرح ہو گئے تھے؟

☆☆ اس کے لئے میں نے اپنے آپ کو ایڈمنسٹریشن میں دھکیل دیا۔ عبادت بریلوی کے زمانے میں صدر شعبہ اردو بعد میں ڈین اور عبادت بریلوی پرنسپل پھر میں صدر شعبہ اور ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد تینوں عہدے میرے پاس

تھے۔

☆ سنا ہے جب آپ کے پاس اختیارات تھے تو آپ نے بھی عبادت صاحب کے ساتھ سخت رویہ اپنایا تھا۔

☆☆ بالکل درست سنا ہے آپ نے! اختلاف وہ پرنسپل ہو گئے اور مجھے بھی چارج دے کر نہ جاتے تو میں اُن کے خلاف تحریری شکایات کرتا۔ ہمارے درمیان کبھی رو برو گفتگو نہ ہوا کرتی۔ تمام معاملات تحریری ہوتے تھے۔

☆ خیرات ابنِ رسا سے بھی آپ کے تعلقات کشیدہ رہے؟

☆☆ سات سال تک میں سینڈیکیٹ کا ممبر، تین کمیٹیوں کا ممبر اور تیرہ کا انچارج تھا جب تینوں اہم عہدے میرے پاس تھے تو خیرات صاحب ایکس سینڈیکیٹ میں سے چودہ میں آیا کرتے تھے۔ جس کے باعث گیارہ ممبر میرے ساتھ اور تین خیرات صاحب کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ گورنر جیلانی سے کہہ کر خیرات صاحب نے سینڈیکیٹ ختم کرا دیا اور نیا ایکٹ بنوایا۔ ڈین کی مدت تین سال ہوا کرتی ہے جبکہ میں چھ سال ڈین رہا۔ بعد میں میرے جونیئر ذوالفقار ملک کو ڈین بنوا دیا اور میں صرف پرنسپل اور شعبہ اردو کا سربراہ رہ گیا اور سینڈیکیٹ سے بھی خارج ہو گیا۔

☆ آپ پر ایک کمیونسٹ طالب کو داخلہ دینے کا الزام بھی اسی زمانے میں لگا تھا؟

☆☆ روس کی ایک لیکچرار ایم اے اردو کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی بھیجی گئی۔ خیرات صاحب نے اُسے یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور مجھے زبانی حکم دیا کہ میں اُسے داخلہ دے دوں۔ میں نے اُن سے کہا کہ اس وقت جمعیت کا بڑا زور ہے وہ ہنگامہ کریں گے۔ خیرات صاحب نے چٹ پر لکھ کر حکم دیا کہ اس خاتون کو داخل کر کے چٹ واپس بھیج دو۔ میں نے خاتون کو ایم اے میں داخلہ دے کر چٹ اپنے پاس رکھ لی۔ جب مشتعل طلبہ نے اس واقعہ کو جواز بنا کر خیرات صاحب کے دفتر پر حملہ کیا تو خیرات صاحب نے سارا ملبہ میرے سر پر ڈال کر گورنر کو رپورٹ پیش کر دی۔ میرے دوست ایم شفیع مرحوم کے گورنر جیلانی سے اچھے مراسم تھے میں نے چٹ کی فوٹو اسٹیٹ مع درخواست گورنر کو بھیج دی۔ اس پر خیرات صاحب کو گورنر سے ڈانٹ پڑی اور انہوں نے میرے گھر میں آ کر مجھ سے معافی مانگی۔

☆ آپ کے ناقدین کبھی آپ کو جماعت کا حامی کبھی پیپلز پارٹی کا حمایتی گردانتے کر بقول آپ کے آپ پر وار کرتے رہے۔ آپ اصل میں ہیں کس نظریات کے آدمی؟

☆☆ سب سے پہلے تو آپ مجھے انسان دوست اور انسان نواز کہہ سکتے ہیں۔ ازاں بعد میرا شمار سید ھے ہاتھ والوں میں کیا جا سکتا ہے مگر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں جماعت اسلامی سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھتا اور نہ کسی دوسری سیاسی جماعت سے مجھے کوئی نسبت ہے۔

☆ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ جب آپ یونیورسٹی میں زیرِ عتاب تھے تو پیپلز پارٹی کے طلبا نے آپ کی بھرپور حمایت کی تھی؟

☆☆ دیکھئے! اس وقت پیپلز پارٹی میں دائیں بائیں کی کشمکش موجود تھی۔ میری حمایت میں طلبا کا جو گروپ سرگرم تھا وہ خود کو پیپلز پارٹی کا رائٹسٹ گروپ کہلواتا تھا۔

☆ ایک طرف آپ بابا رائٹ وابستگی دائیں والوں سے جتلا رہے ہیں دوسری طرف آپ حلقہ اربابِ ذوق میں سرگرمی کا ذکر بھی فرما رہے ہیں؟

☆☆ تقسیم ہند سے پہلے یہاں ترقی پسندی کا اثر زور رہتا۔ یہ درست ہے کہ شروع میں بہت سے ترقی پسند حلقہ اربابِ ذوق میں شامل رہے کیونکہ اُن کا سیاسی اور سماجی زندگی پر زور تھا اور یہ لوگ معاشرے کی اجتماعیت پر زور دیتے تھے جبکہ حلقہ اربابِ ذوق انفرادیت کا حامی تھا۔ شروع شروع میں ملے جلے اثرات کے ساتھ حلقہ چلتا رہا مگر آہستہ آہستہ یہ صورت حال تبدیل ہوتی گئی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ ماسکو یا روس سے ہدایت لیتے ہیں تو میں اُن سے الگ ہو گیا۔ وہ لوگ ہر چیز میں انقلاب دیکھ رہے تھے اس لئے اُن کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی تھی جبکہ حلقہ اربابِ ذوق ادب کو بطور ادب لیتا تھا جس کے پس منظر میں سماجی زندگی آتی تھی۔ ترقی پسند لوگ سماجی زندگی کو ادب پر مسلط کرتے تھے اور اُسے انقلاب کا وسیلہ قرار دیا کرتے تھے اس طرح جزوی تخلیق کا داخلی عمل نظر انداز کیا جاتا تھا۔

☆ مقتدرہ قومی زبان میں آپ کب اور کس طور تشریف لائے؟

☆☆ ڈاکٹر خیرات محمد ابنِ رسا میری مخالفت میں تمام حدیں پار کرنے کو تیار تھے۔ ایک دھڑکا انہیں یہ بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں مجھے یونیورسٹی کا وائس چانسلر نہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ جس روز مرکزی حکومت کی جانب سے "مقتدرہ قومی زبان" کے صدر نشین کی پیشکش ہوئی اسی روز میں نے ہر طرح کی چپقلش سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆ مقتدرہ قومی زبان کا آئینی رول کیا ہے؟

☆☆ پاکستان کے آئین میں ایک شق ۱۹۸۸ء تک اردو کو بطور دفتری زبان اور ذریعہ تعلیم نافذ کرنے کی موجود ہے اس کے لئے حکومت کو ایک ادارہ بنانے کا پابند کیا گیا ہے جو اس حوالے سے مناسب تیاری کرے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ضیاالحق کے استاد تھے لہٰذا انہوں نے اُن کی نگرانی میں کابینہ ڈویژن کا ذیلی ادارہ ۱۹۸۰ء میں تشکیل دے دیا۔ یہ ادارہ کسی طور بھی با اختیار نہ ہے تمام اختیار حکومتِ وقت کے پاس ہیں کہ وہ مقتدرہ کی سفارشات پر عمل درآمد کرے یا نہ کرے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مقتدرہ قومی زبان کے پاس اردو زبان کو نافذ کرنے کا اختیار ہے۔ افسوس یہ تصور درست نہیں ہوتے ہوئے بھی غلط ہے۔ مقتدرہ کو اپنی وضع

کردہ سفارشات کو حتمی شکل تک دینے کا اختیار نہیں ہے۔ مثلاً ہم نے سرکاری محکموں کے ناموں کے ترجمے کئے مگر ایک بھی محکمے نے ہمارے ترجمے کئے ہوئے t اسکو قابل توجہ نہ گردانا۔ اس لئے کہ مقتدرہ کو authentication کا اختیار نہیں ہے۔

☆ سنا ہے مقتدرہ قومی زبان سے جبراً رخصتی پر آپ نے روتے ہوئے خدا حافظ کہا تھا؟

☆☆ یہ بات تو درست ہے کہ میری رخصتی جبری تھی۔ جونیجو صاحب میرے حق میں نہ تھے۔ مسلم لیگ گروپ کے ایک صاحب اُمیدوار تھے اور ان کے اسی دور کے ایک دوست وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری تھے لہٰذا اُن کو آنا تھا اور وہ آگئے۔ میں اگر آبدیدہ تھا تو اپنی ذات کے حوالے سے نہیں بلکہ اردو زبان کے حوالے سے اقتدار شاہی پر آبدیدہ تھا، ورنہ عہدے تو آتی جاتی چیز ہیں۔

☆ آپ کو کتاب اور اقتدار کا شوقین گردانے والے کس قدر درست ہیں؟

☆☆ جس قدر کتاب کا شوقین کہہ کر احباب نے میری عزت افزائی فرمائی اُس سے زیادہ اقتدار کا شوقین کہہ کر میری عزت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں اُن کے اس الزام کی تردید نہیں کروں گا بلکہ جواب میں اُن سے یہ کہوں گا کہ اگر ڈوبتے علمی ادبی اداروں کی سربراہی کا، اُن اداروں کو اُن کے پیروں پر کھڑا کیا اور اُن کو دوبارہ سے زندہ اور فعال کیا، شوقِ اقتدار ہے تو میں اس جرم کا فخریہ اقبال کرتا ہوں۔

☆ اس قدر بھرپور مفید اور معیاری زندگی کے بعد آپ جس طرح کا بھی حسین تاثر قائم کریں، برحق تصور کئے جائیں گے؟

☆☆ میں کیا اور میری بساط کیا۔ مجھے تو اپنی زبان اور ادب کا مستقبل اُمید افزا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی تصنیف میں اردو زبان کو مسلمانوں سے منسوب کرنے کے باعث اردو زبان کا بھارت میں مستقبل جو پہلے ہی مخدوش تھا اور بھی مخدوش ہو گیا ہے۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں کی مدد سے اردو کو دھکیل کر انگریزی کے لئے جگہ بنائی جا رہی ہے۔ انگلش میڈیم کے لازم ہونے کی وجہ سے اردو ادب کے باقی رہنے کے رہے سہے امکانات بھی ختم کئے جا رہے ہیں۔ زبان کے مسئلہ پر آپ ایک بات مدنظر رکھیں کہ مسئلہ اکیڈیمک نہیں رہا بلکہ سیاسی بن چکا ہے۔ انگریزی اشرافیہ کی زبان بن چکی ہے جو کہ ایک طاقتور طبقہ ہے اور علم نسق پر قابض ہے۔ اُن کی آل اولاد انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھتی تھی اور مڈل کلاس پر حکومت کرتی تھی۔ جس کی زبان اردو ہے مڈل کلاس سرسید کے سامنے منظر عام پر آئی تھی یہی مسلمانوں کے تمام مسائل کی کتا دھرتا تھی۔ اب یہ کلاس سمٹ کر بے بس ہو چکی ہے۔ جیسے جیسے ملک میں اقتصادی ترقی ہوئی ہے امیر طبقہ امیر تر اور غریب طبقہ غریب تر ہو گیا ہے۔ اردو اب صرف متوسط طبقہ کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ صوبائی زبانوں کو اس طرح ہوا دی گئی ہے کہ زبانوں کے درمیان دشمنی اور تضادم کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ جو قومی تشخص پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ ہم کلچر کے بجائے سب کلچر کے نام لیوا ہو گئے ہیں۔ میرے ذہن میں خاکہ یہ صورت حال پاکستان کو ایک سے زیادہ ملکوں میں تقسیم کرتی نظر آتی ہے۔ انگریزی کی اجارہ داری کو مستحکم کیا جا رہا ہے۔ جس سے کئی سیاسی سماجی پیچیدگیاں جنم لے رہی ہیں۔ قومی زبان میں سوچنے کی صلاحیت ختم ہو رہی ہے نتیجہ یہ کہ ہم سائنس کے اُستاد تو پیدا کر رہے ہیں مگر سائنسدان ہم باہر سے امپورٹ کر رہے ہیں۔ ہمارے طالب علموں میں اپنے مضمون کی مبادیات بھی واضح نہیں ہیں۔ انگریزی ہمارا میڈیم بن گیا ہے۔ منصوبہ بندی سے ہم قطعی عاری ہو چکے ہیں۔ سائنس کی لاٹھی سے ساری قوم کو ہانکنے کے باوجود نتیجہ صفر رہ گیا ہے۔ اب ٹیکنالوجی سے ہانک رہے ہیں اس کا نتیجہ ٹیکنیکل کلرک پیدا کرنے کی شکل میں برآمد ہو رہا ہے۔ جس ملک میں اتنے طبقات ہو جائیں جو ایک دوسرے کی بات تک نہ سمجھیں وہاں ملک کی ترقی اور استحکام کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

☆ آپ کی علالت اور صاحب فراش نے مالی طور پر آپ کو بہت ضعف پہنچایا ہوگا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کی خبر گیری امداد و تعاون کی کوئی شکل دستیاب ہے کہ نہیں؟

☆☆ پروردگار عالم کا مجھ ناچیز پر یہ خاص کرم ہے کہ اُس نے مجھے بیماری، معذوری اور آزمائش کے اس کڑے وقت میں بھی رزق حلال پر زندہ رکھا ہوا ہے۔ گورنمنٹ کالج پنجاب یونیورسٹی نے مجھے پروفیسر آف امیرٹ بنا لیا ہے مزید ہر دوسرے روز اُن کی گاڑی آکر لے جاتی ہے اردو فارسی کے مقالوں کی نگرانی کے لئے۔ اس کے عوض یونیورسٹی مجھے پچیس ہزار ماہوار ادا کرتی ہے جس سے میری بیماری اور گھریلو اخراجات کسی قدر پورے ہو رہے ہیں مگر نیشنل بینک اکاؤنٹ تو مدت سے صفر کے ہندسے پر ٹکا ہوا ہے۔

☆ قارئین چہارسُو اہلِ ادب اور اہلِ وطن کے لئے کوئی پیغام نصیحت یا تلقین؟

☆☆ میاں گھر دو جا دو! کچھ دیر پہلے تک آپ عقل و شعور کی باتیں کر رہے تھے۔ اچانک آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ آپ نا عقلی کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ میاں پیغام نصیحت وعظ اور تلقین حکمرانوں اور سیاستدانوں کے چونچلے ہیں۔ درویشوں، فقیروں، ادیبوں، شاعروں اور تخلیقکاروں کو یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا۔ آپ کی خواہش کے احترام میں اپنا ایک شعر آپ کی نذر کر کے رخصت چاہیں گے اور دعاؤں کے طالب رہیں گے۔

خیالِ دشت ویاں فکرِ شب نہ بجھاؤ
فردگی دوغم ابھی تو راہ بہت ہے

کھیالی کا ایک علم پرور خاندان

ڈاکٹر احمد حسین قلعداری

برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ جو تباہی و بربادی رونما ہوئی تاریخ کے اوراق میں وہ ایک طویل داستان ہے۔ پنجاب میں سکھا شاہی اور جتھا گردی نے لوگوں کا آرام و سکون تک چھین لیا۔ لوگوں کو اپنی جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ علماء کرام اپنی جانیں بچانے کے لئے شہر چھوڑ کر دور دراز دیہات میں جا مقیم ہوئے۔ سلام کہیے ان کے احساسات اور پاکیزہ جذبات کو کہ اس پریشانی کے عالم میں بھی انہوں نے اشاعت اسلام اور ترویج علوم دین کو اپنا شعار بنالیا۔

اسی طرز کے ایک خانوادہ کا تذکرہ تباہی و بربادی سے اجڑے ہوئے دیوانوں کے ملبے سے تلاش کر کے جو کچھ دستیاب ہوا آپ کی نذر کرتے ہیں۔

گوجرانوالہ شہر کے جنوب کی جانب شیخوپورہ جانے والی شاہراہ پر کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر کھیالی ایک معروف گاؤں آج بھی بڑی شان و شوکت سے آباد ہے کسی زمانہ میں یہ قریہ علم و حکمت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ علم و حکمت اور عرفان و رشد روشنی اس جگہ سے دور دور تک پھیلی اور پنجاب کے گوشہ گوشہ میں روشنی ہوئی۔

حضرت داتا شاہ جمال نوریؒ

کہا جاتا ہے کہ حضرت داتا شاہ جمال نوری علیہ الرحمۃ سلسلہ قادریہ کے بہت بڑے بزرگ تھے جن کا سلسلہ رشد و ہدایت ایک واسطے سے حضرت شاہ میاں میر لاہوری سے جا ملتا ہے۔

آپ کے مورث اعلیٰ فاتح اسلام پاک و ہند سپہ سالار اسلام محمد بن قاسم کی قیادت میں برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے۔ آپ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے تھے۔ اسلامی فتوحات کے بعد آپ کچھ عرصہ موضع آکڑ شریف میں مقیم ہو گئے اور ڈیرہ غازی خان میں جا کر سکونت اختیار کر لی۔

اور درس و تدریس شغل حیات ٹھہرا لیا۔ حضرت داتا شاہ جمال نوری نے جب ہوش سنبھالا تو علم و حکمت اور عرفان و رشد کی دولت ان کے گھر لٹائی جا رہی تھی اور آپ اس روشنی کی متاع سے مالا مال ہوئے۔ یہ شوق کچھ اس طرح دامن گیر ہوا کہ کسی نوعیت کا دست سیرابی سے تشنگی فرو نہیں ہوتی تھی۔ آپ نے آکڑ سے رخصت ہو کر لاہور کا رخ کیا اور لاہور کے معروف عالم دین حضرت شاہ اسماعیل المعروف میاں وڈا کی دینی درسگاہ واقع مغلپورہ لاہور میں داخل ہو گئے اور علوم دین کے اور بھی اعلیٰ مدارج طے کئے پھر روحانیت کی دولت کے لئے حضرت شاہ میاں میر لاہوری علیہ الرحمۃ اللہ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور سلوک کی اعلیٰ منازل طے کر لیں پھر حضرت شاہ میاں میر لاہوری نے آپ کو اپنے خلیفہ حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے سپرد کر دیا۔ باقی ماندہ منزلیں حاصل کرتے روشنی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچے۔

رشد و ہدایت میں کامل ہوئے تو آپ کو حضرت شاہ میاں میرؒ نے عرفان و حکمت کی روشنی عام کرنے کے لئے موضع للیانی متصل گوجرانوالہ چلے جانے کا حکم دیا۔ آپ اپنے پیر و مرشد کے ایما پر یہاں آ کر مقیم ہو گئے اور گردونواح کے عوام کو دین اسلام اور رشد و ہدایت کی تلقین کی۔ للیانی اور گوجرانوالہ اس زمانہ میں سکھوں کا گڑھ تھا اور کفر و باطل کا اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ آپ کے دست حق پرست پر ہزاروں لوگوں نے بیعت کی اور بے شمار لوگ مشرف با سلام ہوئے اور اس دور میں موضع کھیالی عرفان و حکمت کا ایک اہم مرکز نظر آنے لگا۔ آپ نے ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی اور گوجرانوالہ کی سرزمین میں جہاں آپ نے ہدایت کی روشنی عام کی مدفون ہوئے آپ کی قبر آج بھی گوجرانوالہ میں بیرونی کھیالی میں موجود ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم و شاہ عبدالکریم

آپ کی وفات کے بعد آپ کے دو فرزندوں حضرت شاہ عبدالرحیم و حضرت شاہ عبدالکریم نے آپ کے مشن کو بدستور جاری رکھا جس سے دور دور تک روشنی ہوئی۔ ضلع گوجرانوالہ اور ضلع شیخوپورہ میں آپ کے مریدین کی تعداد کثرت سے پائی جاتی ہے۔ ان کے زمانہ میں سکھی عہد کی چیرہ دستیاں اپنے انتہا کو پہنچ رہی تھیں۔ ان پریشانیوں چیرہ دستیوں کے باعث آپ کے احوال آثار و پریشانی کے گھاؤ نے پردوں میں مستور ہو گئیں۔

حضرت شاہ شیر محمد غازی

ان بزرگوں کی وفات کے بعد سید ارشاد و حضرت شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے حضرت شاہ شیر محمد غازی نے شبابی دور میں اپنے دادا کے نقش قدم پر چل کر علم و حکمت اور عرفان و ہدایت کی روشنی دور دور تک پھیلائی اور اپنے وقت کے جید عالم دین اور کامل ولی اللہ مشہور ہوئے تھے۔ سکھا شاہی کے مظالم بڑھتے جا رہے تھے آپ نے ان کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا بقول اکبر الٰہ آبادی۔

رپٹ جا کر حریفوں نے لکھا دی آج تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

آپ کو اس فتویٰ کی پاداش میں شہید کر دیا گیا۔ آپ کا مزار پر انوار موضع کھیالی میں موجود ہے آپ کی شہادت وہیں واقع ہوئی۔

حضرت میاں محمد فیض

حضرت شاہ شیر محمد غازیؒ کی شہادت کے بعد سید ارشاد ان کے

نامور فرزند حضرت میاں محمد فیض صاحب نے سنبھالی۔ حضرت میاں فیض اپنے وقت کے جید عالم دین صوفی کامل اور نعت گو شاعر تھے ہم ان کا اس جگہ تذکرہ بحیثیت استاد، بحیثیت مصنف، بحیثیت محقق کے کرتے ہیں۔

دینی درس گاہ

حضرت میاں محمد فیض صاحب نے اپنے بزرگوں کی روشنی عرفان و رشد کی بجائے درس و تدریس کو اپنا شعار بنایا اور لوگوں کو علم و حکمت کی روشنی سے منور کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علم و حکمت کی پرانی یادگاریں ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھیں۔ کمیالی اس وقت علم و حکمت کا عظیم مرکز تھا۔ جہاں دین کے لئے دور دور سے لوگ آ کر علم و حکمت سے سرشار ہوتے رہے اور اس دور کے اکابر علمائے دین اس دینی درس گاہ سے فیض یاب ہوتے اس زمانہ میں آج کل کی طرح اسکولوں اور کالجوں کی طرح رجسٹر حاضری نہیں ہوا کرتے تھے کیونکہ طلبہ کے اعداد و شمار سے غرض و غایت نہ ہوا کرتی تھی۔ مفت ترویج علوم اسلام کے لئے کی جاتی تھی

۔ اس لئے حضرت میاں محمد فیض کے شاگردوں کی فہرست پیش نہیں کی جا سکتی۔ البتہ نمونے کے طور پر ان کے ایک شاگرد کا تذکرہ شامل کر لیا جاتا ہے جس سے اس کی دینی درس گاہ کی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔

مولوی محمد ابراہیم کہجائی اپنے وقت کے صوفی کامل اور متبحر عالم دین تھے کسی وقت مولوی محمد فیض کمیالی سے اکتساب فیض کیا مولوی محمد صالح کہجائی اپنی کتاب سلسلۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں۔

زبدۃ العلماء والحکما مظہر صدق و یقین صاحب ورد و دین معروف اخلاق کریم حضرت میاں شیخ محمد ابراہیم طبیب، عالم کامل و زاہد و متوکل و رفیع الشان۔

تاریخ وفات ۱۳۲۳ء

اس عملی درس و تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت میاں محمد فیض نے علمی و دائمی تدریس کا بھی اہتمام کیا میرا اشارہ ان کی تصانیف کی طرف ہے جو مرنے کے بعد بھی لوگوں کی راہنمائی کرتی ہیں۔ حضرت میاں فیض نے متعدد اہم تصانیف بھی یادگار چھوڑیں اور وہ بھی وقت کے ظالم ہاتھوں نے دنیا سے مٹا کر دیں۔ منشی گیشں داس اپنی کتاب چہار باغ پنجاب میں لکھتے ہیں۔

میاں فیض محمد ملاحت تخلص کہ مراۃ الحساب تصنیف اوست و شرح مکاتبات علامی و کلیات خوب کردہ است۔

ان تصانیف میں البتہ شرح مکاتبات علامی کے دو نسخے راقم الحروف کے کتب خانہ میں موجود تھے ایک خوبصورت نسخہ مولوی محمد عالم کلمہ داری مرحوم کے کتب خانہ میں موجود تھا۔

شرح نویسی کوئی آسان کام نہیں ہوتا اس کے لئے شارح کو مختلف علوم پر حاوی ہونا ضروری ہوتا ہے اور یہ خوبی حضرت میاں محمد فیض میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ شرح مکاتبات علامی میں سے چند مثال کرتے ہیں جن سے حضرت میاں محمد فیض کا علمی مقام متعین ہوتا ہے۔

اس طرح کی متعدد مختلف العلوم کی تشریحات شرح مکاتبات علامی میں درج ہیں جو حضرت میاں محمد فیض کے پایہ علمی کی وضاحت کرتی ہیں کہ فیض کن علوم کے ماہر استاد تھے۔

یہ شرح انہوں نے کسی مولوی سلطان احمد کے کہنے پر ۱۲۱۲ھ میں تحریر کی خود لکھتے ہیں۔

ی گوید کمینہ حیرت ابوالفیض محمد ملاحت کہ میری استدعا ہے بعضے آشنایاں وفتا، آشنا خصوصاً فضیلت مآب فضائل دستگاہ سویدا جاں نیر مولوی سلطان احمد کہ سخن را بزرشناس است۔ پیش ازیں بچہار سال مطابق ایں تاریخ

ز ملک ملاحت ایں سواد و نگش
دروقت کوچہ قش تربیت جست
ہر بکہ کسیب فکر مردم جوں صدف
تاحیہ سال چوں در اقادہ بدست
گر چشم بہم زنی ز آہو ساش
ایں شرح ملاحات جانی دست

شرح مکاتبات علامی کے دیباچہ میں مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ اور حمد باری تعالی میں یہ شعر:

تعالی اللہ زہے بے شبہ و بے چوں
زہر چوں و چرا ئی عقل بیروں

اور نعت سرور کائنات میں:

دراہم احمد آں مسکیں کہ پیدا است
یکی آئینہ رو کی اعدا است

واضح کرتے ہیں کہ حضرت میاں محمد فیض شعر و سخن کا بھی بے حد شوق رکھتے تھے ملاحت ان کا تخلص تھا افسوس ان کے شعر و سخن کا تمام سرمایہ دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا مولوی غلام قادر شاکر کی بیاض قلمی اور مولوی بشیر حسین مرحوم کی کوہ نور میں سے آپ کا صرف یہی شعری قطعہ دستیاب ہو سکا ہے جو شامل ہدیہ کیا جاتا ہے۔

حضرت میاں محمد فیض کمیالی کے والد کا زمانہ حیات سکھا شاہی اور چھلا گیوں کا بھرپور زمانہ تھا جس سے سوائے تباہی و بربادی اور کوئی آثار دستیاب نہیں ہوئے۔ میاں فیض محمد صاحب نے اس دنیا میں پختہ عمر پائی ہو گی۔ افسوس ہے کہ ان کے معاصر علما کی فہرست کا حتی پتا نہیں ہو سکی جس سے اندازہ

ہوسکے کہ آپ نے کن کن صاحبانِ علم و حکمت کے درمیان رہ کر عقل و دانش کے گل کھلائے؟ آپ کے شاگردِ عزیز مولوی ابراہیم کھائی کے احوال کے سلسلہ میں مولوی محمد صالح کھائی نے مرزا مقصود بیگ مفتی محمد یونس شاہ مرشد اور حضرت مولوی محمد صالح گجراتی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی معاصر درسگاہوں سے مولوی محمد ابراہیم کھائی نے اکتسابِ فیض کیا۔

شرح مکاتیبِ علامی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی معاصر درسگاہوں سے مولوی محمد امین سوہدہ مرحوم اور مولوی محمد افضل ساکن کھوڑی موسیٰ خان کا ذکر آیا ہے۔

ان کے علاوہ غلام رسول ساکن ککرہ قاضی فضل حق وزیر آبادی۔ حافظ محمد ککروروی متعین کے اعتبار سے ان کے معاصر تھے۔

اسی دور کے متعدد فتویٰ شرع ہمارے کتب خانوں میں موجود ہیں جن پر مولوی محمد فیض کے دستخط بھی کے علاوہ متعدد علماء و معاصر کی مہر ہیں اور دستخط ثبت ہیں مگر یہ سب نامی نام ہیں بحث زبان ان کے مرتبہ و مقام بتانے سے بالکل خاموش ہیں۔

مولوی نور احمد

مولوی نور احمد حضرت میاں محمد فیض کے فرزند ارجمند تھے اور الولد سر لابیہ کے مصداق ان تمام خوبیوں کے مصداق ان تمام خوبیوں سے مالا مال تھے جو ان کے بزرگوار میں پائی جاتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ملتان تشریف لے گئے کہا جاتا ہے کہ وہاں ایک مجذوب خاتون کی توجہ سے ظاہری و باطنی علوم سے بدرجہ اتم فیض یاب ہوئے ویسے بھی علم و حکمت کی کمی ان کے خانوادہ میں پہلے سے ہی نہیں تھی۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار کی دینی درسگاہ کو اپنے دور میں فروغ دیا اور مجاحب میں قریب کا فتویٰ جاری ہوا خدا نجانب میں جو بھی فتویٰ جاری ہوتا اس پر مولوی نور احمد کے دستخط ضروری سمجھے جاتے تھے ہمارے کتب خانے میں متعدد پرانے فتوے موجود ہیں جن پر مولوی نور احمد کے دستخط ضروری موجود ہیں مثال کے طور پر ایک فتویٰ بھی ملاحظہ ہو۔

باسم سبحانہ تعالیٰ

استفتاچہ فرمایند علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اندراں کہ شخصے است کہ زوجہ آں حیکا روبد افعال است کہ دو شارع عامی خودی ونا خود قریب فقرا کم نشیں۔

فقیر سید الحسنی مولوی نور احمد صاحب کے شاگرد رشید تھے جن کی ذات سے فتویٰ جاری ہوا۔ مولوی نور احمد صاحب نے توثیق کی خان محمد خان ککروار ضلع گجرات شیخ مسعود جلال پور جٹاں سعید احمد موضع شادیوال کے رہنے والے تھے اور اپنے وقت کے اعلیٰ علماء میں ہوئے منکر بنیا دہو صاحب کے متعلق کہیں سے کوئی اطلاع دستیاب نہیں۔

مولوی نور احمد صاحب نے رشد و عرفان کے ساتھ ساتھ اپنے والد بزرگوار کی طرح درس و تدریس کو اپنا شعار بنایا اور ان کی درسگاہ سے ہزاروں طالبانِ دین فیض یاب ہوئے اور وہ ملک و دین کے اعلیٰ علماء میں شمار ہوتے تھے۔

فرزندانِ مولوی نور احمد غلام قاسم

مولوی نور احمد صاحب کے چار صاحبزادے محمد حیات، محمد سلطان، کرم الٰہی اور غلام قاسم۔ جن کے علم و فضل کی یادگاریں ان کے ساتھ مفقود ہو گئیں صرف حضرت غلام قاسم کے قلم کا لکھا ہوا قرآن مجید کا نسخہ راقم الحروف نے ماسٹر محمد صادق ولد خان بہادر امام دین صاحب کے ساتھ مجھ محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول کے پاس دیکھا تھا۔ حسن خط اور اس میں پختگی ان کے علم و فضل کی نشاندہی کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب فرمایا کرتے تھے یہ نسخہ میرے نانا غلام قاسم کے قلم کا لکھا ہوا ہے حضرت غلام قادر کی قبر روضہ میں کوجہ انوالہ بیرون کھیالی دروازہ میں موجود ہے آپ خادم حرمین الشریفین میں تھے۔

میاں احمد یار

مولوی احمد یار، مولوی نور احمد صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔ سکھوں کے پر آشوب زمانہ میں لوگوں کو یادِ الٰہی کی تلقین کرتے رہے۔ درویش منش بزرگ تھے آپ کا مزار بیرون شاہ دستگیر دیوار نگر میں موجود ہے۔

مولوی محبوب عالم

مولوی غلام قاسم کے بیٹے اور مولوی نور احمد کے پوتے تھے اور اجداد بزرگوار کی روحانی، دینی عظمت کے امین تھے۔ بڑے جید الصورت ہیں تو حسنِ صورت و سیرت سے آراستہ تھے۔ گوجرانوالہ اور اس کے نواح میں اپنی عظمت مسلم تھی۔ حکومتِ وقت نے آپ کی وجاہت و شباہت کے پیشِ نظر ان کو آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ عطا کر دیا تھا۔

بلدیہ گوجرانوالہ کے صدر بھی رہے۔ لیکن ان سب جاہ و وقار سے قطعِ نظر ان کو اپنے بزرگوار کا مسلک ہر نوع عزیز تھا۔ علم و حکمت کی دولت کے باعث علمائے عصری میں نہایت عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے آپ کا فتویٰ آخری ہوتا تھا اور دیگر علمائے عصر کے فتووں پر آپ کی توثیق ضروری سمجھی جاتی تھی۔

راقم الحروف مرزا محمد حسین عمر اعجد کے بزرگوار سید احمد اعظم سے ایک مسئلہ کی تحقیق میں آپ کی خط و کتابت جاری رہی۔ علامہ سید احمد اعظم مشاعت و بلاغت کے پیشِ نظر مراسلہ کا جواب نہایت اختصار سے لکھتے جبکہ مولوی محبوب عالم صاحب بڑی تفصیل سے ورق در اوراق تحریر کر کے جواب ارسال کرتے۔

شاگردوں کے استفسار پر علامہ صاحب آپ تو صرف ایک مراسلہ کا جواب لکھتے اور مولوی صاحب اس کا جواب مراسلہ کی صورت میں ارسال کرتے ہیں۔ کیا ان کے پاس کتابیں اور معلومات آپ سے زیادہ ہیں۔

علامہ صاحب نے فرمایا کہ گجرات (نواح) سیالکوٹ کے متصل بڑا شہر ہے وہاں کاغذ آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے مولوی محبوب عالم کو کاغذ سیاہ کرنے کا ہمیشہ شوق رہتا ہے ورنہ اہل علم کی مراسلت میں اشاروں سے بھی حیات پائی جا سکتی ہے زیادہ سے زیادہ کتابیں کے مسودے کافی ہوتے ہیں۔ کتابیں ہمارے پاس بھی ہیں اوراق پر ہماری نظر بھی ہے یہ صرف مولوی صاحب کے ذوق وشوق کی بات ہے۔

مولوی محبوب عالم صاحب کے یہ صرف کتب خانہ ہوئے ان کے ناسور برادر زادہ غلام جیلانی کے مکتبہ میں دیکھا باوجود اس کے کہ کتب خانہ نہایت پریشان حال تھا جس کا بیشتر حصہ دستبرد زمانہ ہو چکا' بہر حال زندہ سرمایہ ظاہر کرتا ہے کہ کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی۔

مولوی محبوب عالم صاحب نے محی الدین ابن العربی اندلسی کی مشہور کتاب فصوص الحکم کی شرح جامعہ مولوی اسد اللہ الہ آبادی کا خوبصورت کشمیری اوراق پر فارسی رسم الخط میں تحریر کیا جو خطاطی کا ایک لاجواب نمونہ تھا اس نسخہ کو دیکھ کر آپ کے ذوق وشوق علمی معیار حسن خط اور محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

محبوب عالم صاحب نے اپنے حسن ہمت وپا کبازی کی روش سے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ کشمیری اوراق کی اجزا آٹھ دس دس اوراق کی بنائی ہر جزو لکھتے وقت ہر ہر ورق بسم اللہ الرحمن پر بے اہتمام لکھی اور جب جزو دوم لکھی بسم اللہ والے ورق کے ایک کونے پر تاریخ ومقام ومقصود اوراق لکھ دیے جو ان کے ذوق وشوق اور ایک خاص اہتمام کا نمونہ پیش کرتے ہیں ہم صرف ان تمام اجزاء کے یہ الفاظ تحریر کرتے ہیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ آپ نے کتابت کا یہ سفر کس پیار ومحبت سے طے کیا۔

الجزو الاول من شرح فصوص الحکم اوروہ عشر یہ کے تحت یوم الجمعہ واحد یوم من ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ۔

الجز الثانی من شرح فصوص الحکم تحت فی ۱۲ من محرم ۱۳۹۴ھ۔

الجز والثالث من شرح فصوص الحکم اور مرقد عشرہ تحت فی ۲۳ محرم ۱۳۹۴ھ۔

الجز والرابع شرح فصوص الحکم تحت فی صفر المظفر ووراقہ عشرہ۔

الجز والخامس من شرح فصوص الحکم اور اقہ واحد عشرۃ تحت فی ۲۷ صفر ۱۳۹۴ھ۔

الجز والسادس شرح فصوص الحکم اوراقہ عشرہ تحت فی ۲۸ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ۔

الجزو السابع من شرح فصوص الحکم اوراقہ عشرہ تحت فی ستہ عشر من رجب ۱۳۹۴ھ۔

الجزو الثامن من شرح فصوص الحکم اوراقہ عشرہ ایضاً تحت ۲۰ شوال ۱۳۹۴ھ۔

الجزو التاسع من شرح فصوص الحکم اوراق ایضاً عشرہ تحت ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ۔

الجزو العاشر من شرح فصوص الحکم اوراقہ ایضاً عشرہ تحت اختتام محرم الحرام ۱۳۹۵ھ۔

الجزو الحادی عشر من شرح فصوص الحکم اوراقہ عشرہ تحت فی ۱۲ صفر المظفر ۱۳۹۵ھ۔

شرح الثالث عشر من فصوص الحکم اوراقہ ایضاً عشرہ تحت فی ۸ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ۔

الجزو الرابع عشر من شرح فصوص الحکم اوراقہ عشرہ تحت فی ۳۰ ربیع الاول۔

الجزو الخامس عشر من شرح فصوص الحکم اوراقہ عشر تحت فی ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ۔

الجزو السادس عشر من شرح فصوص الحکم اوراقہ عشرہ تحت ۲۱ شوال ۱۳۹۵ھ۔

الجز السابع عشر من شرح فصوص الحکم واوراق ایضاً عشر تحت فی کیم ۱۳۹۷ھ۔

الجزو الثامن عشر من شرح فصوص الحکم واوراق ایضاً عشر تحت ۸ جمادی الثانی ۱۳۹۸ھ۔

الجزو التاسع عشر من شرح فصوص اوراقہ ایضاً عشر فی ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ۔

الجزو العشرین من شرح فصوص الحکم اوراقہ ایضاً عشرہ تحت فی ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۹۸ھ۔

الجزو الحادی العشرین من شرح الحکم واوراق تحت فی اواخر جمادی الثانی ۱۳۹۸ھ۔

الجزو الثانی العشرین شرح فصوص الحکم تحت فی ۷ رجب ۱۳۹۸ھ بر اسم الریاض۔

اور آخر میں ان الفاظ میں تحریر کیا جس سے ان کی عربی زبان پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے الحمد للہ انور القلوب العارفین الحمد لنا کی والصلوٰۃ علی افضل البشر وسیلۃ للطالبین الکاملین من الاصحاب والاول والتابعین رضوان اللہ علیہم قرنین علی اتمام المجید الشریعۃ للشیخ افضل الموحدین من المتاخرین وزبدۃ

الکاتب شیخ محب اللہ۔

آمین ثم آمین یوم الجمعہ بعد صلوٰۃ جمعہ۔

کتاب کی کتابت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ساڑھے چار سالہ کتابت میں صرف کرنے کے بعد اپنے برادرزادہ غلام قادر زیرک کے تعاون سے اصل کتاب کے ایک ایک لفظ کا تقابل کیا۔ تصحیحات تحریر دور کر نا کر نسخہ بہر نوع مضامین اصل رہے۔ آخر میں اپنے دستخط تحریر کئے اور مولوی غلام قادر زیرک سے بھی دستخط کروائے جیسے کسی وثیقہ پر دستخط کئے جاتے ہیں دستخط کا انداز ملاحظہ ہو:

چنانچہ اصل مثنوی صحت و غلطی جو چنان نقل مقابل کردہ شد۔

العبد محمد محبوب العالم نقل حتہ۔ العبد غلام قادر

جزو ملاد ماشعر ین میں ایک صفحہ پر حضرت میاں محمد میر کے چند اشعار درج کر دیے ہیں جو انہوں نے کسی اہل شہیر صاحب جالندھری سے سنے حضرت میاں محمد میر صاحب کے یہ اشعار حضرت مولانا محبوب عالم کے اس نسخہ کی بدولت دنیا میں محفوظ رہ گئے ہم جہد یہاں درج کرتے ہیں تا کہ یہ تبرکات سمجھیں۔

تصنیف جناب محمد میر قدس سرہ العزیز دو فرمان مبارک سید علی شہیر جالندھری۔

سرے کر بامہ شیدیم زنشاں
از علم مبین ور درگوش باخوش
اے نسخہ نام الٰہی کر قوی
اے زمینہ جال شاہی کر قوی
بیرون قومیت ہر چہ ہم ست
از خود وطیب بر انچہ خواہی کر قدی

اس کی تصویر علمی معیار کی اسی اہتمام سے مکمل ہوئی مولوی محبوب عالم تحریر مولوی محمد میاں میر صاحب مولوی غلام قادر زیرک نے حضرت مولانا غلام جیلانی صاحب کے کتبہ میں دیکھی جو پریشان حال میں تھیں مخصوص علم تو لہٰذا ہم نے نقل کر لئے خیال تھا تمام کتابوں کے موافق اسی طرح نقل کر لئے جائیں تا کہ یادگار رہیں لیکن مولوی غلام جیلانی صاحب کو قدرت نے اپنی طرف بلا لیا اور ہمارا یہ منصوبہ نا تمام رہا۔

مولوی صاحب کی وفات کے بعد یہ کتاب خانہ محفوظ نہ رہ سکا میری آرزو ہے کہ میری شاعری پر ان کے احباب کوشش کریں تا کہ اس دستاویزات سے کچھ اس طرح کے کوائف بھی جمع ہو جائیں تا کہ بزرگوں کی نشانیاں کسی حد تک محفوظ رہ سکیں۔

مولوی غلام قادر زیرک

مولوی محبوب عالم صاحب کی اولاد نرینہ نہ تھی انہوں نے اپنے حقیقی بھائی حسام الدین کے بیٹے غلام قادر کو جو بیٹا رکھا تھا مولوی غلام قادر کے علم و ادب کے آثار کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے۔ مولوی غلام جیلانی صاحب کے تکیہ میں ہم نے مولوی محبوب عالم کا کتب خانہ دیکھا۔ اس میں متعدد کتابیں مولوی غلام قادر زیرک کے قلم کی لکھی ہوئی تھیں۔ حسن خط اور قلم کی پختگی اور کتابوں کے تحریر سے ان کے ذوق و شوق اور علم و فضل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فارسی عربی علوم ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی۔

مولوی غلام جیلانی صاحب

مولوی غلام جیلانی صاحب غلام قادر زیرک کے فرزند اکبر نے والد کی وفات کے سند نشین درگاہ حضرت شاہ جمال نوری میر سے آپ کے باشجرہ درویش صفت بزرگ تھے اوائل عمری میں شادی ہو گئی۔ آپ کے سسر مولوی علاؤ الدین صاحب تھے لیکن بیوی جو کہ باکباز اور نیک سیرت خاتون تھی ایک سال بعد ہی داغ مفارقت دے گئی تھی۔ مولوی غلام جیلانی صاحب جن کے مزاج میں بچپن سے فقر و درویشی کے احساسات موجود تھے ترک دنیا کر کے حضرت شاہ جمال نوری کی درگاہ پر بیٹھے اور اپنی زندگی کی تمام بہاریں فقر و ذکر میں بسر کر دیں۔

راقم الحروف بندہ اور حسین قریشی کے قیام گجرانوالہ کے دوران ان سے اکثر شرف ملاقات رہا۔ نہایت ہی شفقت و محبت پیش کرتے ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپ میں فقر و تصوف بدرجہ کافی موجود تھیں حرص و طمع اور دنیاوی حرص سے آپ کی طبیعت بالکل بے نیاز تھی اگر لوگ حاجت مند آپ کی درگاہ میں حاضر ہوتے کسی چیز کا بھی مطالبہ کرتے مولوی غلام جیلانی نے کبھی انکار نہ کیا اور کسی کو مایوس واپس نہ لوٹایا۔ شربت کا دور ہر وقت چلتا رہتا اور لوگوں کا ہجوم ہر وقت آپ کے گرد حاشیہ نشین ہوتا۔ جناب حضرت میاں میر لاہوری کے سلسلہ سلوک کرتے اور ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے ہر سال ان کے عرس پر بڑے اہتمام سے حاضری دیتے۔

آپ کی وفات بہت شام ہوئی اور درگاہ حضرت شاہ جمال نوری میں ہمیشہ ہمیشہ کی رفاقت پا کر محو خواب ہو گئے۔

با جو غلام ربانی و فضل الٰہی

مولوی غلام جیلانی صاحب کے دو میاں غلام ربانی اور باجو فضل الٰہی بھی درگاہ حضرت شاہ جمال میں رہا کرتے تھے بزرگوں کی روشنی سے تپ کر رزق حلال کی خاطر انہوں نے ملازمت اختیار کر لی تھوڑا ہی عرصہ ان بزرگوں کی یہ بھی یادگاریں دنیا سے رخصت ہوئیں۔

حاجی عاشق حسین

مولوی غلام جیلانی صاحب نے اوائل عمری میں ایک معصوم بچہ

کیس سے لیا اور اپنے بچوں کی طرح پرورش کی۔ روحانی منزل سے مالا مال کیا۔ یہ سعادت مند برخوردار ساری عمر حضرت مولانا مولوی غلام جیلانی کی خدمت میں رہا اور کبھی دل میں نافرمانی کا شائبہ تک نہ لایا اور آخری وقت تک خدمت گار رہا۔

جیسے کبھی فرزند کا روحانی کے امیر صادق ہوا کرتے تھے اس برخوردار کا نام عاشق حسین ہے جن کو اپنے والدین کا کوئی علم نہیں ان کے سب کچھ مولوی غلام جیلانی صاحب ہی تھے۔ مولوی غلام جیلانی صاحب کی وفات ہوئی تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا عاشق حسین دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا جیسے اس کے لئے کل جہان تاریک ہو گیا۔ ویسے بھی اس کا جہان واقعی اجڑ کر رہ گیا۔

عاشق حسین کو مولوی غلام جیلانی صاحب کی وفات کی سعادت حج حرمین شریفین نصیب ہوئی۔ وہ حاجی عاشق حسین اور حضرت شاہ جمال نوری مولوی محبوب عالم اور غلام جیلانی صاحب کی درگاہ کے متصل حضرت شاہ مبارک نوری کی درگاہ پر مسند نشین ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اس سعادت مند حاجی کی عمر دراز کرے اور بزرگوں کا صدقہ ان کے فیض کا چشمہ جاری رہے۔

میاں خدا بخش

اسی خاندان کی دوسری شاخ حضرت میاں شیر محمد غازی کے حقیقی بھائی میاں خدا بخش سے شروع ہوتی ہے جس میں کچھ علم و حکمت کی شاعری ہوتی ہے۔ بے حد افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے کے کوئی اہم علمی و ادبی آثار دستیاب نہیں ہوئے سوائے اس کے کہ میاں خدا بخش کے پڑپوتے مولوی محمد اشرف کے قلم کا لکھا ہوا نہایت ہی خوبصورت قرآن مجید کا نسخہ ہم نے حضرت مولانا مولوی غلام جیلانی صاحب کے پاس دیکھا تھا۔

اس نسخہ کے متعلق ایک اہم روایت گوجرانوالہ میں مشہور تھی کہ گوجرانوالہ کے معروف عالم دین اور بے مثل خطاط مولوی سراج دین نے قرآن مجید کا ایک نہایت ہی خوشخط نسخہ تحریر کیا اور والی ریاست بہاولپور نواب صادق حسن خاں کی نذر کیا۔ نواب صاحب نے یہ نسخہ اپنی ریاست کے عجائب خانہ میں رکھ دیا۔

۱۹۱۰ء میں امریکن سیاح عجائب خانہ دیکھنے آئے تو اس نسخہ کا نذرانہ دس ہزار روپیہ پیش کرنا چاہا لیکن نواب صاحب نے یہ نسخہ دینے سے انکار کر دیا۔ مولوی محمد اشرف صاحب نے یہ نسخہ اس نسخہ کے جواب میں تحریر کیا جو مولوی سراج دین کے نسخہ سے کسی نوع کم نہیں تھا۔ افسوس قرآن مجید کا یہ خوبصورت نسخہ غلام جیلانی صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح محفوظ نہ رہ سکا۔

مولوی محمد اشرف صاحب کے پڑپوتے محترم ڈاکٹر وحید قریشی نے اس خاندان کی گرتی ساکھ کو دوبارہ بحال کر کے اس کو دوبارہ عروج پر پہنچایا۔

ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فارسی ایم اے ہسٹری کے امتحان پاس کئے اور بعد میں پی ایچ ڈی فارسی اور اردو ادبیات میں خدمات کی موثر ڈگری حاصل کی پہلے ہکل اسلامیہ کالج گوجرانوالہ پھر اسلامیہ کالج لاہور میں بطور پروفیسر کام کرتے رہے بعد میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پرنسپل ہو گئے۔ ملک کے سب سے علم و ادب اردو مقتدرہ قومی زبان اردو کے صدر ہے علم و ادب میں آپ کی عظمت مسلمہ ہے اور برصغیر کی اہم علمی و ادبی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔

یہ مختصر خاکہ تذکرہ اس خاندان جس نے دو صدیاں برصغیر میں علم و ادب و حکمت کی روشنی پھیلائی اور برصغیر کے اذہان کو اخلاق و ادب کی حکمت سے جلا دی۔ افسوس اور بے حد افسوس اس روش زمانہ پر ہے جس نے اس خاندان کی عظیم علمی و ادبی آثار کو دنیا سے محو کر دیا۔ صرف چند اشارے باقی رہ گئے ہیں جن کو ہم نے محفوظ کر لیا ہے۔

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کے اڑا لے گئی ہوا کے ایک

ماخذات

اس مقالہ کی تدوین کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے امداد لی گئی ہے

نمبر	کتاب	
۱۔	سلسلۃ الاولیا مصنف مولوی محمد صالح کمبالی	قلمی
۲۔	تاریخ جلیلہ مولوی غلام دستگیر خاں	مطبوعہ
۳۔	جہاد باغ پنجاب منشی گنیش داس	مطبوعہ
۴۔	شرح حکایات علائی مصنف محمد فیض مملوکہ ڈاکٹر احمد حسین قریشی	قلمی
۵۔	بیاض گلگی مولوی غلام قادر سوکتری	قلمی
۶۔	عربی ادبیات کی تعمیر میں پنجاب کا حصہ مصنف و مملوکہ ڈاکٹر احمد حسین قریشی	قلمی
۷۔	تاریخ خوردونی مصنف عبدالشکور احمد عالم	مطبوعہ
۸۔	شرح مثنوی اکمل الہ آبادی مملوکہ مولوی غلام جیلانی صاحب مرحوم گوجرانوالہ	قلمی
۹۔	مثنوی دانش مملوکہ مولوی غلام جیلانی صاحب مرحوم گوجرانوالہ	قلمی
۱۰۔	تذکرہ عاقدین شمیر پنڈت گنیش منظور احمد	مطبوعہ
۱۱۔	تسخیر خانوادہ مملوکہ عتیق گل ساکن گوجرانوالہ	قلمی

بستی کے لوگو

ممتاز مفتی

ڈاکٹر وحید قریشی نئے نئے اسلام آباد آئے تو میں نے ان کے ایک دوست سے پوچھا کہ یار ڈاکٹر وحید قریشی کیا چیز ہے۔ وہ مسکرایا کہنے لگا "مفتی! ڈاکٹر وحید قریشی دیکھنے کی چیز نہیں برتنے کی چیز ہے۔"

میں نے کہا "بھئی یہ بھی بتا دو کہ کیسے برتتے ہیں۔"

بولا "اسے ادبی محفلوں میں دور سے دیکھو۔ پاس بٹھاؤ گپ شپ کرو، سکینڈل سناؤ پھر دیکھو۔"

ذرا ڈاکٹر کی جانب دیکھئے معتزیت کا ایک ڈھیر لگا ہے۔ گھبرائیے نہیں یہ صرف باہر کی بات ہے۔ اندر جھانکو تو ایک معصوم بچہ رنگین غبارے سے کھیل رہا ہوگا۔ بات کرتے ہوئے سنو تو معقولیت ہی معقولیت کا تاثر دیا جائے گا۔ اندر کان لگاؤ تو تار بج رہی ہیں۔ سولہ سال کی اک دوشیزہ گنگنا رہی ہے۔ بھرپور جذبات، کوئل آواز، مدھر گیت، بے ربط، بے سُر، بے ساختہ خالص لا معنی بول بجا ناچ گت کر رہا ہے۔ دھن دھا گتن دھا گے۔

صاحبو! ڈاکٹر وحید قریشی پانی صفت ہے۔ صراحی میں ڈالو تو صراحی بن جائے گا۔ مٹی کے پیالے میں ڈالو تو پیالہ بن جائے گا۔ اسلام آباد پنڈی کی علمی ادبی محفلوں میں میں نے اسے مرصع صراحی بنے ہوئے بھی دیکھا ہے اور جام سفال بھی۔ پھر ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت میں ایک ایسی چمک بھی دیکھتا ہوں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آنکھوں میں رنگ پچکاری چھپائے بیٹھا ہے۔ اب کوئی کرپا نہاں کھول تو دیکھے۔

ایک ڈاکٹر وحید کی ہی بات نہیں۔ یونیورسٹیوں میں جتنے سینئر پروفیسر ہوتے ہیں سب متانت کے ڈول بنے ہوتے ہیں۔ ہوں کیوں نہ ہوں۔ جنہیں ہر وقت پچاس ساٹھ نوجوان آنکھوں کے جوڑے تحسین و احترام کی پگھلیاں جلاتے رہیں بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں رنگ پچکاریاں نہ ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو صدر بنا دو تو سولہ آنے صدر بن جائے گا۔ پہلے تو لگا پھر منہ سے بولنے لگے۔ حاضرین میں آخری نتیجہ پر تھا وقت بحث کرنے سے نہیں جھجکے گا۔ بحث میں لگا ہو تو عالمانہ موشگافیاں نکالتا ہے جیسے علم ہی اوڑھنا بچھونا ہو۔ جا بجا کیس ظاہر ہوتا تو ہیں پابندیاں لگا دیتا ہے جیسے سوجھ بوجھ سے عاری ہو۔

ڈاکٹر وحید قریشی جب نیا نیا اسلام آباد آیا تھا تو ہم ڈر گئے تھے۔ ڈرنا تو تھا ہی جب اس جیّد کا نقاد میدان میں اترا تو ہم سے جیسے منشی لوگ دوڑ کر اپنے بلوں میں جا گھستے ہیں۔ لیکن یہ خوف کا عالم چند روز ہی رہا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے آتے ہی ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔ پنڈی اسلام آباد کے ادبی حلقوں کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ادبی محفلوں میں صدر کسے بلایا جائے۔ اس نے یہ مشکل مستقل طور پر حل کر دی۔ پھر پریشان خٹک کی آمد پر مہمان خصوصی کا مسئلہ بھی احسن طور پر حل ہو گیا۔

پرانے زمانے میں ایک کہاوت تھی ان تینوں سے بچ کر رہیو کالے چھوٹے موٹے سے۔ آج کل اس کہاوت میں ترمیم ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں ان تینوں سے بچ کر رہیو عالم فاضل ناقد سے۔

عالم کے متعلق سیانے کہتے ہیں Master are Monsters۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا ہے کہ جوں جوں آپ عالم بنتے جاتے ہیں توں توں آپ کی میں میں پھونک بھرتی جاتی ہے۔ ویسے تو عالم اکٹھے بیٹھتے ہی نہیں۔ جہاں اکٹھے بیٹھیں میں میں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ رہے عاقل تو وہ خواہ اپنی زندگی جذبے کے زور پر گزارتے ہیں۔ دوسری بات کرتے تو عقل کا چسکا چکھانے لگتے ہیں۔ سو نقاد آکٹر کی طرح ہوتے ہیں ان کی انگلی آپ ہی آپ غلطی پر جا رکتی ہے۔

پھر وہ بات:

ع نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے....

ہم عام بندے تو اس بات کے خواہاں ہیں کہ کوئی غم دل سننے والا ہو۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ بھید پالیا ہے کہ علم اور عقل بوقت ضرورت استعمال کرنے کی چیزیں ہیں، خود پر طاری کرنے کی نہیں۔ ڈاکٹر نے علم اور عقل کو خود پر طاری نہیں ہونے دیا۔ طاری کر لیتا تو راون بن جاتا۔

نہیں کیا تو رام بن گیا ہے۔

علم اور عقل کو استعمال کر کے پھر پوٹلی میں باندھ کر الماری میں رکھ دیتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی بنیادی طور پر ایک کاہی ہے۔ اتنی بوجھل ڈگری، اتنا اونچا گریڈ اور صدر نشینی ڈائریکشن کے باوجود ذات کا کاہی ہے۔ وہ اردو قومی زبان کا ڈھنڈورا پیٹے جا رہا ہے، پیٹے جا رہا ہے، پیٹے جا رہا ہے، یوں پیٹے جا رہا ہے جیسے سننے والے سن رہے ہوں۔

سننے والے نہیں سن رہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا مقصد خود سنانا نہیں عوام کو سنانا ہے کہ انہیں تسلی رہے کہ کام ہو رہا ہے۔

تقسیم کے بعد جب مجید ملک کو اعمور اردو بورڈ کا ڈائریکٹر بنایا گیا تو میں نے کہا "تو مفتی اب تو موج ہو گئی۔" کہنے لگا "کیوں؟" میں نے کہا "اطمینان سے اردو نافذ کرو۔" وہ ہنسا بولا "مفتی! تو نہیں سمجھے گا تو سیاست میں کورا ہے۔ یہ بورڈ اس لئے نہیں بنایا گیا کہ اردو نافذ کرے بلکہ اس لئے کہ اردو کے نفاذ میں التوا پیدا کرے۔ لوگوں کو تسلی رہے کہ کام ہو رہا ہے۔ مقصد کام کرنا نہیں تسلی دینا ہے۔"

سرکار بھی کیا شے ہے۔ کچھ کھیلے اس لئے بنتی ہے کہ کام ہو اور کچھ اس لئے کہ کام ہوتا نظر آئے۔ لیکن نہیں۔ کچھ بلاکاروں کو چھوٹے گریڈ دے کر ہاتھ میں ہنر پکڑا دیتی ہے۔ کچھ لوگوں کو صدر نشین بنا کر ہاتھ میں جھنجھنا تھما دیتی ہے۔ اللہ کے فضل سے اس وقت ہمارے ہاں دو صدر نشین بیٹھے ہیں۔ ایک اردو زبان کا دوسرا

اردو اکادمی کا۔

صرف ڈاکٹر وحید قریشی ہی نہیں اب تو عوام بھی جانتے ہیں کہ سیاسی مصلحت کی وجہ سے اردو زبان ابھی تک پاکستان میں سرکاری طور پر رائج نہیں ہو سکی۔

لیکن اس وجہ سے کیا نتائج پیدا ہو رہے ہیں اس کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا۔ میں ان تمام اداروں کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جو نفاذ اردو کے لئے کام کر رہے ہیں کہ صاحبو! مجھ پر ترس کھاؤ میں وہ بدقسمت فرد ہوں جس کی کوئی پہچان نہیں۔

میں انگریزی میں سوچتا ہوں۔ اردو لکھتا ہوں۔ پنجابی بولتا ہوں۔
میں پنجابی پڑھ نہیں سکتا۔ اردو بول نہیں سکتا۔ انگریزی لکھ نہیں سکتا۔
گھر میں پنجابی بولتا ہوں۔ میری بیٹیاں اردو بولتی ہیں۔ میرے پوتے انگریزی بولتے ہیں۔

سبحان اللہ کیا کھچڑی پک رہی ہے میرے گھر میں۔
کسی تحریک نے میرے گھر کو تماشا بنا دیا ہے۔

بیٹیوں سے پوچھتا ہوں کہ بی بی تم اردو کیوں بولتی ہو۔ ہماری ماں بولی تو پنجابی ہے۔ وہ جواب دیتی ہیں۔ ابو ہر جگہ اردو بولی جا رہی ہے۔ سکولوں میں، کالجوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، محفلوں میں۔"

پوتوں سے پوچھتا ہوں کہ میاں تم گھر میں انگریزی کیوں بولتے ہو۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمیں اے لیول پاس کر کے بڑا افسر بننا ہے کیوں نہ بولیں انگریزی۔

سچ کہتے ہیں۔ انہیں میری طرح ساری عمر کلرکی کرنا منظور نہیں۔

میرے پوتے دوڑتے دوڑتے میرے پاس آتے ہیں پوچھتے ہیں بابا۔ چہار سو کا کیا مطلب ہے میں کہتا ہوں سنو فورسو وہ چہار سو کے معنی سمجھ کر خوش خوش چلے جاتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ جب وہ بڑے افسر بنیں گے تو کب چاہیں گے کہ اردو نافذ ہو جائے۔ نافذ ہو گی تو وہ کس سے پوچھیں گے کہ چہار سو کا کیا مطلب ہے وہ خوف زدہ ہیں کہ انہیں چہار سو کا مطلب اپنے چپڑاسی سے پوچھنا نہ پڑے۔

یہ کالا صاحب فرنگی بہادر کا تحفہ ہے۔ جو صغیر سے ورثے میں ہو کر وقت اس نے ہمیں بخشا تھا۔

صاحبو! جب فرنگی بہادر رخصت ہوا تھا اس وقت لاہور میں صرف تین انگلش سکول تھے۔ اب تین ہزار سے زائد ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے میں پوچھتا ہوں آپ کس امید پر کتابوں پر کتابیں لکھے جا رہے ہیں۔ کیوں اپنی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ اپنا تحقیقی کام تیاگ دیا ہے اپنی دو کشتی کر رکھی ہے۔

کالا صاحب بہت سیانا ہے کائیاں ہے۔ اس نے اپنے تحفظ کے لئے قومی زبان کو سیاسی مسئلہ بنا دیا ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اور اب کوششیں چاہے خفی ہوں یا جمہوری اس مسئلے سے خوف زدہ ہیں۔ بیچاری کوششیں، مجھے ان پر ترس آتا ہے۔

آج کل اسلام آباد میں اردو کی ادبی محفلوں پر بہار آئی ہوئی ہے۔ آئے دن فائیو سٹار ہوٹلوں میں محفلیں سجتی ہیں۔ جن کی صدارت ڈاکٹر وحید قریشی کرتے ہیں اور بڑے بڑے وزیر مہمان خصوصی کی حیثیت سے ان محفلوں میں زینت افروز ہوتے ہیں اور بڑے خلوص اور جذبے سے اردو ادب سے اظہار عقیدت کرتے ہیں۔

اور میرے ادبی ساتھیو آپ میں ہم سب کو پر سہرے سجائے ڈائس پر کھڑے ہو کر بڑی شان سے اپنے اپنے مضامین پڑھتے ہیں۔ آپ تالیاں بجاتے ہیں۔ اس وقت میرے اندر سے ایک آواز ابھرتی ہے۔ یہ تم کیا کر رہے ہیں۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہماری زبان تو بیکر ٹریٹ سے باہر دھتکاری ہوئی، پھٹکاری ہوئی، شرمندگی کی ماری منہ چھپائے کھڑی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی سلامت اور حوصلہ میں نے بہت کم اشخاص میں دیکھا ہے ان کے گرد بہت سے حریفوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے لیکن ڈاکٹر نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ حریفوں سے چومکھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔

حریف ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔
دنیا گریڈ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔
صدر نشینی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔
علم و فضل دم دبائے بیٹھے ہیں۔
بڑھاپا اور اس کی جملہ بیماریاں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔

روزمرہ کی ادبی محفلوں کی صدارت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ لہٰذا انہوں نے صدارت میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ لوگ انہیں مولانا نے صدر کہتے ہیں۔

اس لئے کہ ڈاکٹر وحید قریشی میں زندگی کے لئے بے پناہ "اودھ" ہے اور زندگی سے محفوظ ہونے کی بے پناہ صلاحیت ہے کہ فرنگی ککوشیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔

میں اکثر ڈاکٹر سے کہا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر چھوڑ اب بہت ہو گیا کوئی تحقیقی کام بھی کر لے۔ جواب میں وہ نظم کر کہتا ہے کہ وہ بھی حاضر ہے ملاحظہ ہو۔

دیکھوں کے ساتھ شیر اور ہاتھی
دفتر میں بیٹھے گپ کر رہے تھے
اور سوچ رہے تھے محفوظ گھر ہے
اور گھر کے باہر فوجوں کے افسر
کرتے ہیں پل پل سے مسلسل
بھوتوں کا جنگل جنگل میں منگل
منگل منائیں اور گیت گائیں
بستی کے لوگو بستی کے لوگو

اردو ادب کا کوہِ قراقرم

ضمیر جعفری

میرا نام پروگرام کے مشہور مقالہ نگاروں میں شامل نہ تھا۔ مجھے اس ٹیم میں اسی طرح اچانک شامل کرلیا گیا جس طرح وزیراعظم جونیجو نے جناب سجاد حیدر کو اچانک اپنی کابینہ میں شامل کرلیا ہے۔

میں کل سہ پہر اس ایوان کے ''سارجنٹ ایٹ آرمز'' جناب حیدر ملک سے ملنے گیا تو انہوں نے اس تقریب کے حوالے سے ہاتھوں ہاتھ کچھ لکھنے کا حکم دیا۔ گو میرے لئے ایسی سرعت رواروی میں ڈاکٹر وحید قریشی جیسی متنوع، متبحر، محترم اور بھاری بھرکم علمی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا بے حد مشکل تھا۔ مگر ان کے ایک دیرینہ مداح اور نیازمند کی حیثیت سے میں نے اسے اپنے لئے باعثِ اعزاز سمجھا۔

میں جانتا ہوں کہ میں اپنی عجلت، افتاد اور سراسیمگی کی اس حالت میں ڈاکٹر صاحب جیسی جامع شخصیت کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے جزوی طور پر ہی اپنے تاثرات کا آغاز کرسکتا ہوں چنانچہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میں ان کے بارے میں جزوی طور پر ہی درست ہوسکتا ہوں۔ بالکل درست نہیں ہوسکتا۔ بہرحال چند گزارشات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ہم نے ڈاکٹر وحید قریشی کو ان کی نوعمری میں دیکھا ہے جس طرح آج ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر کوئی شخص یہ باور نہیں کرسکتا کہ وہ نوعمری میں کرکٹ کے نامور کھلاڑی بھی رہے ہوں گے۔ اسی طرح ان کی نوعمری میں ان کو دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اتنا محقق، عالم، نقاد، ادیب، اور شاعر ہوگا کہ عظمتوں کے اندازے اس کی مثال اور سند سے قائم کیے جائیں گے۔

ہم ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۳۵ء سے جانتے ہیں جب ہم گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے وہاں ہم نے جس شخص کو علم و ادب کا سب سے زیادہ رسیا پایا وہ پولیس کے انسپکٹر محمد شفیع صاحب تھے۔ شہر کی ادبی محفلوں کی صدارت کرنی عموماً اسی پولیس انسپکٹر کو سونپی جاتی اور وہ ادب اور ادیبوں کو ڈپٹی کمشنر کی نظر سے بچائے رکھتے۔ پولیس لائن میں ان کے کوارٹر پر اہل قلم کی لائن لگی رہتی تھی۔

ہم نے اپنی زندگی میں ان کے ڈیرے پر پہلی مرتبہ پولیس کے باوردی حوالداروں کو اٹک کے مقامی شاعروں کو سلوٹ کرتے دیکھا اور اپنی زندگی میں کسی پولیس افسر کا پہلا گھر دیکھا جس میں مشاغل سے زیادہ پڑھائی ہوتی تھی۔

ڈاکٹر وحید قریشی اسی انسپکٹر کے خواہرزادے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے لہجے میں کبھی کبھی پولیس والوں کی روایتی کڑک بول اٹھتی تھی۔ اگر ان کے آپ کی تمثال چاہئے تو جی چاہتا ہے کہ ان کو کسی انسپکٹر جنرل کی وردی پہنا کر دیکھا جائے اگرچہ وردی کے بغیر بھی یہ شخص بارعب ہے۔ اس شخص سے بہت زیادہ خوبصورت ہے جو کہیں بظاہر نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نوجوان اہل قلم کی حوصلہ افزائی میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے ہیں۔ گذشتہ بیس بائیس سال میں جن نوجوان ادیبوں کو ادبیت و شہرت حاصل ہوئی ان میں کئی اہل قلم ایسے ہیں کہ وہ اہم تو بہرحال ہوتے مگر ڈاکٹر صاحب کی شفقت و پذیرائی کے بغیر لوگوں کو شاید ان کا اتنا علم نہ ہو پاتا۔

ذاتی کتب خانوں میں دو تین کو چھوڑ کر ہم نے اتنی وقیع اور وسیع ذاتی لائبریری اور کہیں نہیں دیکھی جتنی ڈاکٹر صاحب کے گھر پر دیکھی۔ یہاں کتابوں کی کثرت اور ندرت و نوعیت کا یہ عالم ہے کہ اردو اور فارسی میں ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے لئے ان کے گھر میں زینوں سے دو تین مرتبہ اترنا، چڑھنا ہی کافی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس وقت تک ۵۵ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ بہت سی کتابیں ابھی ان کے اندر موجود ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں علمی و تحقیقی مقالات ان کے قلم سے نکل چکے ہیں اسی طرح پاکستان اور ادبیات پاکستان کے محاذ پر ان کے لہولہان کردینے والے قلمی معرکوں کی تعداد بھی سینکڑوں سے کم نہ ہوگی۔

انہوں نے اردو کے علاوہ پنجابی، فارسی اور انگریزی میں بھی لکھا۔ فرصت نہ تھی ورنہ بعض دیگر زبانوں کو بھی سر کر ڈالتے۔ میں حیران ہوں کہ میں اس وقت تخلیق و تحقیق کے اتنے بلند اور اتنے وسیع سلسلۂ کوہِ قراقرم کی کن کن چوٹیوں اور ڈھلوانوں کا ذکر کروں وہ ایک مسلم الثبوت شاعر بھی ہیں۔ نقاد، محقق، معلم، ادیب، دانشور اور عالم بھی۔ نتیجہ یہ کہ اب نہ شاعر کو محقق کے پیچھے کھڑا کیا جا سکتا ہے نہ معلم کو ادیب کے پیچھے۔

جتنی تصانیف ہیں۔ اتنی ہی انجمنوں، اداروں اور تنظیموں کے وہ رکن ہیں۔ اور اب تو خود اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ آپ جس انجمن کے رکن ہوئے عموماً اس کے صدر ہو کر رہے بلکہ صدر نشین ہو کر رہے ابھی تک تو یہی ریکارڈ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ آئندہ بھی تائید ایزدی اسی طرح ان کے زور بازو میں شامل رہے۔

صاحبو!

ہم نے زندگی کے معاملات و معمولات میں ان جیسے گرمجوش آدمی کم دیکھے ہیں بغاوت جو نوجوانوں کا خاصا ہے ان کی رگ رگ میں رواں دواں پائی۔ یہ بغاوت کی وہ قوت ہے جس کے بغیر کوئی آدمی کوئی غیر معمولی کام کر نہیں

سکتا۔ اور ان کی گرمجوشی رنگوں اور ترنگوں کی وہ جوت ہے جو زندگی کے صحرا کو گلستان بنا رہی ہیں۔ میرے نزدیک یہ دو چیزیں ہی ان کی شخصیت اور فن کی اساس ہیں یا انہی خوبیوں کا کرشمہ ہے کہ وہ 55 کتابیں لکھنے کے باوجود زندہ ہیں ورنہ ہم کئی اہل قلم کو جانتے ہیں کہ کتاب لکھنے سے پہلے اچھے خاصے مشہور تھے۔

مگر کتاب لکھنے کے بعد گمنام ہو گئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے بہت لکھا ہے مگر اتنا لکھنے کے لئے خدا جانے انہوں نے کتنا پڑھا ہے۔ کیونکہ جو لوگ بہت پڑھے بغیر بہت لکھتے ہیں وہ عموماً برا لکھنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کے ہاں تو سوئی پانی کا مال ہوتا ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اتنا لکھا ہے مگر جہاں ایک لفظ کی ضرورت ہے وہاں دوسرا لفظ نظر نہیں آتا۔

وہ "جائنٹ سیکریٹریوں" کے قائل نہیں ہیں۔ مجھے ان کے کمال پر بھی حیرت ہے کہ جہاں نثر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ثابت کرتے ہیں وہاں نظم میں کوئی بات ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی نثر نے مدرسے کو منزلت بخشی ہے مگر اپنی نظم کو انہوں نے مدرسے کی ہوا نہیں لگنے دی۔ اکثر علماء کے پاس الفاظ ہوتے ہیں مگر خیالات نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر وحید قریشی دونوں باتوں میں خود کفیل ہیں وہ اپنے فن سے ہراساں بھی کرتے ہیں اور شاداں بھی۔ وہ امکانات کے دروازے نہ صرف کھولتے ہیں بلکہ لوگوں کو ان میں گزرنا بھی سکھاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی ان دروازوں میں خود بھی پھنس جاتے ہیں جس طرح جمہوریت کی خامیاں جمہوری عمل سے دور کی جا سکتی ہیں اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے زندگی کی مشکلات کو ازالات پر انتھک محنت یا مشقت سے قابو پایا ہے۔

آخر میں چند لفظ مقتدرہ کے حوالے سے۔ ان کی صدر نشینی سے پہلے یہ ادارہ ہر چند کہ تھا مگر نہیں تھا۔ آپ نے اس کی مردہ شریانوں میں زندگی کا خون دوڑا دیا اور اس معروض ادارے کو بااختیار اور مقتدر بنا دیا۔ وہ جب تک مقتدرہ میں نہیں آئے تھے ہم ان کو صرف تیز ذہن ہی سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تو بلا کے تیز قدم ثابت ہوئے۔ اگر کوئی ہمیں ایک بھی اچھی کتاب دے جائے تو اس کا احسان عمر بھر نہ بھولنا چاہیے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے تو اس ادارے کے ذریعے خوابوں اور ماہتابوں کا ایک پورا "بابلی جزیرہ" گزشتہ تین برسوں میں نمودار کیا ہے۔

جہاں ہمیں امید ہے کہ حکومت ان کی خدمات سے استفادہ جاری رکھے گی وہاں ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین رہیں گے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو قدرت، ساحلوں پر رہنے کے لئے نہیں بلکہ گردابوں سے لڑنے کے لئے پیدا کرتی ہے۔

ارفع سطح کے شاعر .... عارف عبدالمتین

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی ہمارے عہد کے جید عالم، نامور نقاد اور مستند محقق ہی نہیں ایک نہایت ارفع سطح کے شاعر بھی ہیں اور یہ اسی کمیاب حقیقت کا فیضان ہے کہ ہمیں ان کی دانشورانہ کارکردگی کی ہر مطالعاتی و دلپذیری کے حوالے سے پرمایہ دکھائی دیتی ہے اور ہم اس پر کبھی بے آب و تاب یا بدصورت زدہ ہونے کا الزام نہیں دھر سکتے اور ظاہر ہے اور اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ علم و تحقیق سے عملی وابستگی نے دکھایا ہو تو وہ تخلیقی عمل کی ہمہ جہت پر اسراریت سے یکسر نابلد ہو جاتا ہے جس سے آگہی حاصل کئے بغیر نہ تو وہ خود کسی فن پارے کی درست فنی تحسین پر قادر ہو سکتا ہے اور نہ دوسروں ہی کو اس کی قدرت ارزانی کر سکتا ہے گویا شاعر نہ ہو کر ڈاکٹر وحید قریشی کے وظیفۂ حرف و صوت کی دانائی و قوت کا تخلیقی سرچشمہ ہے اور قدر جہاں آج سے کتنے ہی برس ادھر ان کے اسی تخلیقی سرچشمہ کی موجودگی کا اعلان بن کر طلوع ہوئی تھی۔

اور اب "الواح" کی اشاعت کو ہم ان کے اسی تخلیقی جوہر کی انتہائی معتبر توثیق ٹھہرا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری آسمان شعر پر ایک ایسی قدرتی دھنک کے مماثل ہے جس میں روح، وطن، ملت، نفس، آفاق، جمال اور احترام دو ان سات رنگوں کا امتزاج حاصل ہے جن سے یہ نظر فروز دھنک متشکل ہوئی ہے۔ روح اس معتقداتی اساس کا تعین کرتی ہے جسے توحید و رسالت سے استحکام میسر آتا ہے اور جو کتاب کے نام "الواح" کی وساطت سے بھی اپنے وجود کی گہرائی کا ادراک بخشتی ہے۔ وطن کا حوالہ پاکستان کی سوہنی دھرتی کو اس کی تمام تر ارضی دلکشیوں کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ملت، امت مسلمہ کو اس کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں ہمارے روبرو لانے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ نفس سے ان تلازمہ ہائے خیال کی نشاندہی ہوتی ہے جو شخصیت کے اعماق سے ابھر کر انفرادیت فراہم کرتے ہیں۔

آفاق قریب و دور کے تمام ایسے علاقوں پر محیط ہے جو انسان کو اس کی جغرافیائی تحریر کے احترام کے جلو میں غیر جغرافیائی لامحدودیت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ جمال حسن کارکردگی کے ان تمام حربوں کے ہنرمندانہ استعمال سے عبارت ہے جنہیں ایک فنکار تخلیقی عمل کے دوران نادر تشبیہات، اچھوتے استعارات اور خوب تر علامات وغیرہ کے دلآویز روپ میں بروئے کار لاتا ہے اور احترام اس دوام کے امکانات کا بلیغ اشاریہ ہے جو ہر عہد میں فن اور فنکار کا مقصود و مطلوب رہا ہے۔ یوں ہم الواح کو کمیت کے لحاظ سے مختصر مگر کیفیت کے اعتبار سے نہایت جامع شعری مجموعہ قرار دے سکتے ہیں!

جامع الصفات شخصیت

وارث سرہندی

تاریخوں کے معاملہ میں میری یادداشت ہمیشہ کمزور رہی ہے۔ شہور و سنین مجھے یاد نہیں رہتے۔ اس لئے میں زمانہ کا تعین عموماً واقعات کے حوالے سے کرتا ہوں۔ یہاں تو زمانہ کا صحیح تعین کی ایسی مجبوری بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی سے میرا غائبانہ تعارف تو ان کی بعض کتابیں خصوصاً شبلی کی حیات معاشقہ کے حوالے سے بہت پہلے سے تھا مگر ان سے ملاقات پہلی بار غالباً ۶۰ء یا ۶۱ء کے درمیان کسی وقت ہمارے مشترکہ دوست محمد احسن خاں صاحب کی معیت میں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف بڑی محبت اور خلوص سے پیش آئے اور موسم کے مطابق مشروبات سے ہماری تواضع کی۔ علمی ادبی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی۔ بعد میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کا عملی تعاون بھی بعض حالات میں حاصل رہا۔ اس پہلی ملاقات کا تاثر نہ صرف بعد میں قائم رہا بلکہ یہ تاثر مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس زمانہ میں موصوف یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے بحیثیت استاد وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجلس ترقی ادب کے سہ ماہی مجلہ "صحیفہ" کے مدیر بھی تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ادارت میں آنے سے پہلے "صحیفہ" مجلس ادب کا ترجمان ایک عام سا رسالہ تھا مگر ڈاکٹر صاحب کے زیر ادارت اس مجلہ نے بہت ترقی کی اور علمی ادبی اور تحقیقی میدان میں مجلہ کو علمی و ادبی رسائل میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔

بلاشبہ "صحیفہ" کا یہ دور اس کا سنہری دور تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ادارت سے پہلے اور بعد میں اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے زمانہ ادارت میں "صحیفہ" کے خصوصی شمارے جو غالبیات اور اقبالیات کے موضوعات پر شائع ہوئے وہ ہمارے تحقیقی ادب کا شاندار حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی دور میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے "صحیفہ" میں تبصرہ نگاری کی خدمت تفویض کی اور میں کئی سال تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔

ان تبصروں نے مجھے علمی اور ادبی دنیا میں روشناس کرانے میں بہت مدد کی۔ رسائل و جرائد میں تبصروں کو عموماً کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہوتا یہ محض رسمی سی کارروائی ہوتی ہے۔ یہ تبصرے بہت مختصر ہوتے ہیں اور چند سطور میں کتاب کے سرسری تعارف پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے ان تبصروں میں تحقیقی مقالات کا انداز اختیار کیا اور متعلقہ موضوع پر بحث کے زیر تبصرہ کتاب کے ہر پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے جملہ محاسن و معائب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔

ظاہر ہے ایسے تبصرے طویل ہوتے تھے کوئی اور رسالہ ان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب چونکہ خود تحقیقی مزاج کے مالک ہیں۔ اس لئے انہوں نے میرے تبصروں کو ہمیشہ پسند کیا اور میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہمت افزائی سے میرے ذوق تحقیق کو جلا ملتی رہی۔

آج اگر علمی و ادبی بالخصوص لسانی تحقیق میں مجھے کوئی مقام حاصل ہے اس میں ان تبصروں اور ڈاکٹر صاحب کی ہمت افزائی کا دخل بھی ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب "صحیفہ" کی ادارت سے دست کش ہوئے تو میں نے بھی "صحیفہ" میں تبصرہ نگاری چھوڑ دی۔ کیونکہ جب ڈاکٹر صاحب جیسا قدردان مدیر نہ رہا تھا اور "صحیفہ" کا مزاج بھی بدل گیا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب سے رابطہ ہمیشہ قائم رہا اور وہ میری علمی و ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے اور میری دست گیری کرتے رہے۔ اس کے بعد میری تالیف کردہ لغت، "علمی اردو لغت" شائع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور اس لغت پر ایک عمدہ تبصرہ لکھا۔

جامعہ پنجاب میں تدریسی خدمات سے سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کچھ مدت تک اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس دوران میں اگرچہ ان سے میرا رابطہ کم رہا مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دور نظامت میں اکیڈمی کے منصوبوں پر بڑی تیزی اور تندہی سے عمل کیا اور اپنی فعال شخصیت کا یہاں بھی اثر چھوڑا۔

میری ناقص رائے میں ڈاکٹر صاحب نے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کی حیثیت سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بہت وقیع اور قابل قدر ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان ڈاکٹر اشتیاق قریشی مرحوم کی سربراہی میں کراچی میں قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد سرکاری اداروں میں اردو کی ترویج میں مدد دینا تھا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اس سلسلہ میں نمایاں کام نہ کر سکے۔ اس لئے ان کے دور صدارت میں مقتدرہ کو اتنا وقت نہیں ملا کہ وہ کوئی کار نمایاں انجام دے سکتی تاہم یہ بھی بڑی بات ہے کہ اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے مقتدرہ کی بنیاد صحیح خطوط پر استوار کی اور اس کا ڈھانچہ اس طرح بنایا کہ آئندہ اس میں ترقی اور وسعت پیدا ہو سکے۔ موصوف کی وفات کے بعد میجر آفتاب حسن مقتدرہ کے قائم مقام صدر نشین کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

میجر صاحب اردو کے شیدائی اور ترویج اردو کی تحریک کے سرگرم کارکن ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ اصطلاح سازی کی طرف رہی ہے۔ میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اردو میں اصطلاح سازی کی بھی اب اتنی ضرورت نہیں

ہے کیونکہ اس موضوع پر پہلے ہی بہت کام ہو چکا ہے اور مختلف اداروں نے مختلف علوم و فنون کی اتنی اصطلاحات وضع کر دی ہیں کہ بسا اوقات ان کے انتخاب میں دقت محسوس ہوتی ہے ایک ہی اصطلاح کے متعدد اردو متبادل ہونے کی وجہ سے یہ الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ کسے قبول کیا جائے اور کسے رد۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف اہل قلم اپنی اپنی پسند کے مطابق اپنی تحریروں میں ایک ہی لفظ کے لئے مختلف اردو اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ایک طرح کا اصطلاحی انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف اصطلاح ساز اداروں میں باہمی ربط کا فقدان رہا ہے۔ اگر ان میں ربط ہوتا اور تقسیم کار کے اصول پر عمل کر کے ہر ادارہ اپنے لئے کوئی خاص شعبۂ فن منتخب کر کے اصطلاح سازی کا کام کرتا تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ تاہم قلت کی نسبت کثرت بہرحال بہتر ہے۔ میں نے میجر آفتاب حسن کی سربراہی کے زمانے میں بھی اور بعد میں ڈاکٹر وحید قریشی کے دور صدارت میں بھی اس طرف توجہ دلائی اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ مقتدرہ اب تک وضع کی ہوئی تمام مصطلحات کو جمع کر کے ہر شعبۂ علم و فن کے ماہرین کی مجلس میں ان اصطلاحات میں سے موزوں اصطلاحات کا انتخاب کر کے ان کی متعلقہ شعبوں میں ترویج کے لئے مناسب کارروائی کرے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کے دور میں اس طرف توجہ دی گئی اور اس سلسلے میں اچھا کام ہوا۔

بات میجر آفتاب حسن صاحب کے دور کی ہو رہی تھی۔ میجر صاحب کے زمانے میں مقتدرہ نے کئی منصوبوں کا آغاز کیا اور مقتدرہ میں ترقی کا عمل جاری رہا۔ میجر صاحب کا دور مختصر رہا اور یوں بھی یہ عبوری دور تھا۔ اس لئے بعض منصوبوں کی تکمیل نہ ہو سکی۔ پھر مقتدرہ کی سربراہی کی ذمہ داری ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو تفویض ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ ذمہ داری سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مقتدرہ کا صدر دفتر کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا۔ ایسا ضروری تھا کیونکہ ایک وفاقی ادارہ کا صدر دفتر دارالحکومت میں ہونے کی وجہ سے متعلقہ وزارت سے قریبی رابطہ استوار ہو سکا تھا اور مختلف منصوبوں کی منظوری کم وقت میں آسانی سے ہو سکتی تھی۔

مقتدرہ کو اسلام آباد منتقل کرنے کے بعد وحید قریشی صاحب نے انتظامی امور پر توجہ دی اور مقتدرہ کے مختلف شعبے قائم کر کے تقسیم کار اداروں کے اصولوں پر عمل کیا اور اس میں ہمہ جہت ترقی اور وسعت کا عمل تیز تر ہو گیا اس طرح مقتدرہ مختلف سرکاری محکموں کے درمیان محض رابطہ کا دفتر ہی نہ رہا بلکہ ایک بڑا علمی و اشاعتی ادارہ بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خرابی صحت کے باوجود جس مستعدی اور بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے دور صدارت میں مقتدرہ نے اردو ترقی اور ترویج کے لئے جتنا ہمہ جہت کام کیا ہے اتنا نہ پہلے ہوا تھا اور نہ آئندہ اس کی امید ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کسی بھی شعبۂ علم و فن کو نظر انداز نہیں کیا اور ہر شعبۂ علم و فن کے ماہرین سے رابطہ قائم کر کے ان سے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھوائیں اور مقتدرہ سے شائع کیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا رویہ مصنفین کے ساتھ عام ناشروں سے بالکل مختلف اور دوستانہ رہا۔ موصوف نے مصنفین کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی اور معاوضہ ادا کرنے میں کبھی تاخیر نہیں ہونے دی۔

اس طرح مقتدرہ نے پاکستان کے ایک بڑے اشاعتی ادارہ کی حیثیت سے وہ نیک نامی حاصل کی جو بہت کم اداروں کو نصیب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریک اور ہمت افزائی کے سبب میں نے بھی تحقیق لغت کے موضوع پر مقتدرہ کے لئے متعدد کتابیں لکھیں جو شائع ہونے پر اہل فن کی نظر میں پسندیدہ قرار پائیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے کتب لغت کے لسانی اور تحقیقی جائزہ کا جو منصوبہ بنایا وہ ان کے فکر رسا کا ثبوت ہے۔ ورنہ اس سے پہلے کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا۔ اس منصوبہ کے طفیل اردو کی مشہور کتب لغت کی تحقیق اور چھان بین کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے وہ ایک خاص اہمیت کا حامل اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے بہت مددگار ثابت ہوگا۔

اس سلسلے کی پہلی کتاب حامد علی سید مرحوم کے قلم سے تھی۔ اس کے بعد میں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور اردو کی مشہور کتب لغت جن میں مستشرقین کی تالیف کردہ لغات مثلاً ڈاکٹر فیلن، جان شیکسپئر، ڈنکن فاربس کی تالیف کردہ کتب لغت اور مقامی مؤلفین کی لغات یعنی جامع اللغات، نور اللغات، تاج اللغات کے تحقیقی جائزے میں نے کتابی صورت میں تحریر کئے۔ افسوس ہے کہ وحید قریشی صاحب کے مقتدرہ سے جانے کے بعد یہ منصوبہ ختم یا معطل کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو تحقیق لغت کے سلسلے میں بہت بڑا کام ہوتا۔ مگر ہر شخص کی اپنی ترجیحات اور نقطۂ نظر ہوتا ہے۔

غرض اردو کی ترقی اور ترویج کے ہر شعبہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے نمایاں کام کیا۔ اگر مقتدرہ کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ڈاکٹر صاحب کی وسعت نظر اور ہمہ گیر ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مختلف موضوعات پر کتابچے شائع کئے۔ جن میں اردو کی اہمیت اور صلاحیت کا جائزہ پیش کیا گیا۔ مختلف اہم موضوعات پر مذاکرے کرائے گئے۔ جن میں ماہرین فن نے اپنے خیالات پیش کئے اور اردو کے نفاذ اور علمی ترویج کے سلسلے میں مفید تجاویز پیش کی گئیں۔ اردو املا کے رہنما اصول متعین کئے گئے اردو طابعہ کاری (ٹائپنگ) کی تربیت کا انتظام کیا گیا۔ مختلف محکموں کو دفتری اصطلاحات فراہم کی گئیں اور قوانین و ضوابط کے اردو تراجم مہیا کئے گئے۔

غرض کہ کونسا شعبہ ہوگا جس میں اردو کی عملی ترویج کے لئے بنیاد

فراہم نہ کی گئی ہو۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب تحقیقی مزاج رکھتے ہیں اس لئے جس ادارے سے بھی ان کا تعلق قائم ہوا وہاں تحقیق کے کام کو آگے بڑھایا۔

مقتدرہ میں بھی تحقیقی کام کی بنیاد رکھی۔ آج مقتدرہ ایک بہت بڑا ادارہ بن چکا ہے یہ سب ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کا ثمر ہے اور ان کی انتظامی قابلیت کا ثبوت بھی۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اہلِ علم و قلم میں انتظامی صلاحیت کم ہوتی ہیں اور جن میں انتظامی صلاحیتیں ہوتی ہیں ان کا علم و ادب سے گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو یہ دونوں خوبیاں بدرجۂ اتم ودیعت کی ہیں اور موصوف نے ان صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ بھی مختلف سطحوں پر کیا جس سے علم و ادب اور تحقیق کے میدان میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور قوم و ملک کو بھی فائدہ ہوا ظاہر ہے اس مزاج اور صلاحیت کا حامل شخص نوکر شاہی کا تابع مہمل بن کر نہیں رہ سکتا۔ مقتدرہ کے معاملے میں بھی یہی ہوا اس لئے ڈاکٹر صاحب نوکر شاہی کے تسلط کو ایک علمی ادارے پر برداشت نہ کر سکتے تھے اور نہ نوکر شاہی ایسے آزاد منش اور خوددار شخص کو زیادہ دیر تک برداشت کر سکتی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

حذا فراق و بینی و بینکم ہی ہو سکتا تھا چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے مقتدرہ کی سربراہی سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اب ڈاکٹر صاحب نے اردو اکیڈمی اور بزم اقبال کی سربراہی قبول کر لی ہے تو امید ہے کہ ان کی فکری اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت یہ ادارے بھی اپنے مخصوص دائرہ کار میں نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب اردو فارسی اور انگریزی پر عبور رکھتے ہیں اور ان تینوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا ہے ان کی تصنیف میں ان کا تحقیقی مزاج کارفرما ہے جس موضوع پر بھی لکھا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے لسانیات ادب، شاعری اور تاریخ کے موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کی تصانیف معلومات افزا و فکر انگیز ہیں اور درجۂ استناد رکھتی ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اس لئے جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں مستند معلومات کے موتی بکھیر دیتے ہیں ادب و تاریخ کے علاوہ فنونِ لطیفہ سے بھی موصوف کو شغف ہے کئی سال پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون مصوری کے موضوع پر پڑھا تھا جس سے معلوم ہوا کہ موصوف اس فن کے اسرار و رموز اور مصوری کے مختلف اسالیب اور ان کے ارتقائی عمل سے بھی بخوبی واقف ہیں۔

میں ڈاکٹر صاحب کو ایک محقق اور نثر نگار ہی سمجھتا رہا ہوں لیکن اب بعض رسائل و جرائد میں ان کی غزلیں وغیرہ دیکھیں تو حیرت ہوئی کہ موصوف شاعری میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں ان کے اشعار میں فکر انگیزی، تہ داری اور روحِ عصر کی ترجمانی ہے ان کی حالات پر گہری نظر اور قوت تجزیہ اور قدرتِ بیان کا ثبوت ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف قومی زبان کی حیثیت سے اردو کے عملی نفاذ اور ترویج کے سرگرم حامی ہیں اور اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے اس خصوص میں موصوف اپنے استاد اور پیش رو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کے جانشین ہیں۔ یہ اشتہار بازی کا زمانہ ہے اکثر لوگ اشتہار بازی کے بل پر شہرت حاصل کر لیتے ہیں میں نے دیکھا ہے کہ ایسے لوگ کام بہت کم کرتے ہیں اور شور زیادہ مچاتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اپنی برائے نام کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹتے اور پٹواتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب موصوف صلہ و ستائش سے بے نیاز ہو کر خاموشی سے کام کرتے ہیں۔ ان کو شہرت کی طلب نہیں بس کام سے کام رکھتے ہیں۔ یہ ان کی وسعتِ ظرف اور خلوص کا بیّن ثبوت ہے۔

بحیثیت انسان بھی ڈاکٹر صاحب گوناگوں خوبیوں کے حامل ہیں۔ دوستوں سے بہت خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں اور ان کے کام آنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مداہنت اور منافقت سے دور ہیں اس لئے جو بات دل میں ہوتی ہے وہی زبان پر ہوتی ہے موصوف اپنی رائے کا اظہار بے باکی سے کرتے ہیں۔ کوئی خوش ہو یا ناراض وہ حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے۔ اس حق گوئی اور بیباکی کی وجہ سے موصوف نے بعض لوگوں کی مخالفت بلکہ دشمنی بھی مول لی اور نقصان بھی اٹھایا۔ مگر وہ ہر حال میں اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ موصوف اپنے دوستوں کے لئے سراپا عروف و رعنت ہیں تو دشمنوں کے لئے شمشیرِ عریاں۔ مگر ان کی مخالفت اور دشمنی اصول کی خاطر ہوتی ہے ذاتی مفاد کی بنا پر نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اختلاف برائے اختلاف کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا اختلاف ہمیشہ ٹھوس اور بدیہی دلائل پر مبنی ہوتا ہے ان میں خود پسندی تکبر نام کو نہیں ہے کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور اپنے ملنے والوں سے برابر کی سطح پر ملتے ہیں۔ دوسروں کی رائے کو اہمیت دیتے ہیں اور کھلے دل سے دوسروں کی بات سنتے ہیں اور دوسروں کی خوبیوں کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے میں نے ان کی گفتگو اور رویے میں کبھی خود نمائی کا شائبہ تک نہیں دیکھا۔ کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں تک ہو سکا دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ ان ہی صفات عالیہ اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہو گیا ہے۔

اس قحط الرجال کے دور میں ایسی جامع الصفات شخصیت کا وجود بہت بڑی نعمت ہے اللہ تعالیٰ ان کو زندہ و تابندہ رکھے ان کے دم سے بہت رونقیں ہیں انسانیت کا بھرم اور اہلِ علم کا وقار قائم ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اور اُن کا اسلوبِ تحقیق

ڈاکٹر وفا راشدی

ڈاکٹر وحید قریشی اردو فارسی کے جلیل القدر عالم، شفیق و مخلص اُستاد، نامور اور بلند پایہ محقق و مفکر ہیں۔

پاکستان کے مختلف کالجوں میں ایک طویل عرصے کی معلمی کے بعد مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر، یونیورسٹی اورینٹل کالج کے سربراہ، اقبال اکیڈمی لاہور کے چیئرمین، مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین جیسے اعلیٰ و اہم عہدوں پر فائز رہے۔ سرکاری و غیر سرکاری جس قسم کی ذمہ داریاں انہیں سونپی گئیں، حب الوطنی اور قومی یک جہتی کے جذبے سے سرشار ہو کر ان کو انتہائی نیک نامی اور بھرپور توانائی کے ساتھ بطریق احسن پورا کیا۔ جہاں جہاں وہ رہے اپنی شفقت، اخلاص، رواداری اور وضع داری کی مثالیں قائم کیں۔

سہ ماہی مجلہ لاہور، اورینٹل کالج میگزین، مجلہ تحقیق، سہ ماہی اقبال ریویو، ہفتہ وار اخبار اردو اسلام آباد کے مدیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔

ان دنوں بزم اقبال کا سہ ماہی اقبال لاہور آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے سیکرٹری جنرل اور متعدد قومی علمی و ادبی اداروں کی مجلس عاملہ کے محترم رکن ہیں۔ پاکستان کے سب سے پرانے قومی علمی ادارے انجمن ترقی اردو پاکستان کے متولی ہیں۔

انتہائی مصروفیات اور مسلسل علالت کے باوجود انجمن کے اجلاس میں پابندیٔ وقت سے شرکت فرماتے اور انجمن کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے ہیں۔ آپ کی نگرانی میں بزم اقبال و مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی معیاری مطبوعات جس تیزی سے منظر عام پر آ رہی ہیں ان کی مثال بھی مشکل سے ملے گی۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں لاتعداد ریسرچ اسکالرز ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ کتنے ہیں جو اب بھی ان کی زیر ہدایت جادۂ علم و ادب پر رواں دواں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اکثر شفقت اور اپنائیت سے کام کرنے والوں کے دل بڑھاتے اور ان کی ہر طرح سے مدد فرماتے۔ اس خود سری و خود غرضی، تساہل پسندی اور زر پرستی کی غیر مخلصانہ روش کی فضا میں ایسے مہربان لوگ اب کہاں؟

شب و روز کام کرتے رہنا، دوسروں کے کام آنا، دوسروں کے لئے راہیں استوار کرنا ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ان کے ہزاروں شاگرد ایسے ہیں جو خود اساتذہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور علمی و ادبی دنیا میں خاصی شہرت کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی، فارسی میں پی ایچ ڈی (مقالہ بروئے انتقادی مثنوی فارسی) اور ادبیات میں ڈی لٹ (مقالہ میر حسن اور ان کا زمانہ) ہیں۔

ڈاکٹریٹ کے مقالات کے علاوہ فارسی اور اردو میں ان کی نگارشات کے سرمایہ کی شکل میں کبھی تحقیق اور کبھی تنقید کی صورت میں منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے غالب، اقبال، حالی، شبلی، میر حسن اور محمود شیرانی وغیرہ کے سرمایۂ علمی و ادبی کے حوالوں سے اپنے تحقیقی و تنقیدی مقالات، مقدمات، تعلیقات، تصنیفات میں نہایت دیدہ وری و عرق ریزی سے جو معلومات فراہم کی ہیں۔ بنیادی ماخذات مخطوطات اور جدید مطبوعات کی روشنی میں جو تقابلی جائزے پیش کئے ہیں مضمون کے اقبال کی شاعری جس محققانہ انداز میں کی ہے اس سے بہر صورت متن و حواشی کی اصلاح ہوتی ہے بلکہ پاکستان میں جدید اردو تحقیق کا معیار بلند ہوا ہے تنقیدی امتزاج سے تحقیقی اسلوب کی نئی راہ متعین ہوتی ہے۔

اب ڈاکٹر وحید قریشی کے چند مقالات کے پیش نظر ان کے اسلوب تحقیق کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مقالات ان کی تازہ ترین کتاب موسومہ "مقالاتِ تحقیق" مطبوعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی (۲۵ سی۔ ای سمن آباد) لاہور میں شامل ہے۔

دو سو بہتر صفحات کی اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے [illegible] مقالات ہیں۔ ہر مقالہ اپنے موضوع، مواد اور افادیت کے اعتبار سے اہم ہے۔

"پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال" اس کتاب کا پہلا مقالہ ہے جو دیگر مقالوں کی نسبت قدرے طویل ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقالے میں اردو میں ادبی تحقیق اس کے ابتدا اور ۱۹۶۸ء تک کے تحقیقی رویے کا نہایت جامعیت کے ساتھ (قیام پاکستان سے پہلے، قیام پاکستان کے بعد) کا احاطہ کیا گیا ہے۔

سر سید احمد خاں کے عہد سے تشکیل پاکستان (۱۹۴۷ء) تک کے اردو ادب کی تاریخ و تحقیق کے تناظر میں پاکستان میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کی مدت میں منصۂ شہود پر آنے والے تحقیقی مقالات کی سمت و رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس عرصے میں انفرادی، اجتماعی، علمی و ادبی اداروں، درسگاہوں، دانشگاہوں میں جہاں جہاں بھی تحقیقی کام ہوتے رہے ان کا تذکرہ ہے۔

اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے جدید تحقیقی رجحانات اور مستقبل میں روشن امکانات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس ماہرانہ تجزیے سے نئی نسل کے تحقیقی کاموں کے لئے ایک نیا در وا ہوا ہے۔

"پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مقالہ" سے مراد ڈاکٹر رضیہ نور محمد کا وہ مقالہ ہے جس کا عنوان ہے "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات" اور جس پر پنجاب یونیورسٹی نے مقالہ نگار کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے نزدیک ۱۹۸۰ء تک پی ایچ ڈی (جامعہ پنجاب) کے لئے اس مقالے کے علاوہ دیگر دو مقالات ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا مقالہ "اکبر الہ آبادی" اور ڈاکٹر سلیم اختر کا مقالہ "نفسیاتی دبستان" اردو کے سرمایۂ علمی میں اس اعتبار سے اہم اضافہ ہیں کہ ان میں مقالہ نگاروں کا غالب رجحان تنقید سے زیادہ تحقیق کی طرف ہے۔ یہ تینوں مقالات چھپ چکے ہیں۔

"پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مقالہ" میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اس

کی معنونہ ڈاکٹر رفیع نور محمد کا بہت خوبصورت انداز میں تعارف کرایا ہے اس کے بعد اس مقالہ کی خصوصیات بیان کی ہیں اور مجموعی طور پر اسے پنجاب یونیورسٹی کا ایک کامیاب مقالہ قرار دیا ہے۔

"مثنوی گلزار روئے مراد" اور "دیوان شوق" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی) اردو کے دو مخطوطات ہیں۔ ان کتابوں کے شروع میں انجمن کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی کی بصیرت افروز معلومات آخری حرف چند (بطور مقالات) شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی بحیثیت محقق و نقاد ایک امتیازی شان کے مالک ہیں۔ مثنوی گلزار روئے مراد کی ترتیب و تدوین اس کے متن کی اصلاح اور اضافہ ڈاکٹر صاحب کا عظیم کارنامہ ہے دونوں کتابوں میں جمیل جالبی کے مفصل مقدمات آخر میں ان کی فرہنگیں۔

ڈاکٹر صاحب کی محنت شاقہ عرق ریزی اور دیدہ وری پر دال ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی فراخ دلی سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے ان تحقیقی کارناموں کو سراہا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے زیر نظر مقالات کے تمام پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالی ہے اور ناقدانہ بحث کی ہے۔ فاضل مرتب کی انتھک محنت کی داد دیتے ہوئے بعض اصل متن کی روشنی میں ان کے متن سے معمولی اختلافات کیا ہے۔ مثالوں سے اپنے موقف کی وضاحت بھی کی ہے۔ ان مقالات میں ڈاکٹر وحید قریشی کے مخصوص تحقیقی رویے کے ساتھ ساتھ ان کی تنقیدی روش بھی غالب ہے۔

میر حسن کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بے شمار مخطوطات پاک و ہند کے بیشتر کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ایسی مقبولیت اردو کی کسی اور مثنوی کے حصے میں نہیں آئی۔

میر حسن کے حالات اور ان کی مثنوی سحر البیان پر پاکستان و ہندوستان میں کئی مفید کام ہوئے ہیں ان میں محمود فاروقی کی کتاب قابل ذکر ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن، ان کی زندگی، خاندانی حالات، عہد معاصرین، سحر البیان اور دیگر تصانیف سحر البیان سمیت بارہ مثنویوں پر با تفصیل کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نہ صرف ان مثنویوں کو درست کیا اور ان کے ماخذات کی کھوج لگائی بلکہ ابتدائی چھان بین کے بعد ان تمام غیر مستند ماخذات کو رد کیا۔ ان اغلاط کی تصحیح اور ان لغزشوں کی نشاندہی کی جو ان سے پہلے دیگر محققین سے سرزد ہو چکی تھیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے "میر حسن اور ان کا زمانہ" جیسے اہم مقالے پر جامعہ پنجاب سے ڈی لٹ کی ڈگری کا اعزاز حاصل کیا اس سے پہلے وہ "فارسی مقالہ" پر اور انتقادی مثنوی فارسی پر پی ایچ ڈی کر چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی ان علمی خدمات کے تناظر میں زیر نظر کتاب "مقالات تحقیق" میں شامل مندرجہ ذیل مقالات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی افادیت و اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ حالات حسن کے دو ماخذ "سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ" حسن اور سحر البیان خون نمت ایک نادر "مقدمات میر حسن"۔

ڈاکٹر وحید قریشی فارسی کے بھی عظیم المرتبت اسکالر ہیں۔ فارسی تاریخ ولدیت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ خاندان تیموریہ کے شہزادہ جہاں دار شاہ فرزند عالم ثانی عبدی اردو فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے اور بزم آرا شوقین کے شعر و تھے، امور سلطنت میں بھی درک رکھتے تھے۔ سیاسی مہمات میں اہم کردار ادا کیا شاعری کے جوہر دکھائے شاعروں کی قدردانی کی ان کے درباری شعراء میں خواجہ میر درد کے شاگرد حشمت دہلوی بھی شامل تھے۔

جہاں دار شاہ کے اردو دیوان کے دو نسخے انڈیا آفس لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے نسخے کو اپنے محققانہ انداز میں مرتب کیا ہے۔

اس دیوان کی ترتیب و تدوین کے دوران مولانا امتیاز علی عرشی کے مقالے کو بھی پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوان جہاں دار شاہ کا جو مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا ہے وہ بے حد معلوماتی ہے اپنی تحقیقات سے اسے زیادہ سے زیادہ تحقیقی اور موثر بنایا ہے۔ ان کا اصل ماخذ زیادہ تر فارسی کتب ہیں۔

اگرچہ انگریزی دستاویزات و تواریخ سے شواہد فراہم کئے ہیں۔ اس مقالے کی افادیت اس اعتبار سے بھی بڑھ گئی ہے کہ جہاں دار شاہ کے دیگر سیاسی حالات کے علاوہ اس کے سال ہائے ولادت و وفات کے بارے میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے مدلل مباحث کی روشنی میں صحیح صورت حال سے آگاہ کیا ہے۔

اوپر کی سطروں میں جن مقالات پر اظہار خیال کیا گیا ہے ان کے علاوہ یہ کتاب "مقالات تحقیق" مزید آٹھ مقالات سے مزین ہے جن کے عنوانات یہ ہیں۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کا مقدمہ کلام آتش ایک جائزہ، گلستان سخن ایک تجزیہ، بنیادی اردو ایک تجزیہ، حوالہ جات قانون فوجداری پر ایک طائرانہ نظر، مشرق میں فہرست سازی کی روایت، کنایات تحقیق و تنقید، کتاب امرتل پر ایک نظر اور فن تاریخ گوئی۔ یہ سب مقالات ڈاکٹر وحید قریشی کے تحقیقی مزاج اور اسلوب تنقید کے آئینہ دار ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے یہ "مقالات تحقیق" فن تحقیق و تنقید کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان کے متعدد علوم و فنون سے علم آگہی کے مظہر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تحقیق و تنقید لازم و ملزوم ہیں ان دونوں کے امتزاج سے تحقیق کے ہاں تخلیقی شان نمایاں ہوتی ہے۔ پاکستان میں جن اکابر ادب نے تحقیق کے ساتھ تنقیدی ادب کو سائنٹیفک انداز میں برتا ہے تحقیقی ادب پاروں کو تنقیدی اسلوب سے ہم آہنگ کیا ہے ان میں ڈاکٹر وحید قریشی کا مرتبہ بلند ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے پاکستان میں اردو تحقیق کو استحکام بخشا ہے نئی زندگی عطا کی ہے جدید تحقیق میں نئے رجحانات کی داغ بیل ڈالی ہے ہمارے ہم عصر جواں فکر و جواں سال تحقیق کاروں نے ان رجحانات کو جس خوش اسلوبی و خود اعتمادی سے اپنایا ہے اس سے پاکستان میں اردو تحقیق کی ترقی و ترویج کے امکانات بہت روشن نظر آتے ہیں۔

اُردو ادب کا ہفت خواں

سجاد باقر رضوی

ڈاکٹر وحید قریشی سے میری پہلی ملاقات ۵۶-۱۹۵۵ء میں ہوئی جب وہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ سے لاہور آئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں استاد شعبۂ تاریخ مقرر ہوئے۔ گویا تینتیس چونتیس سال سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ کالج (سول لائنز) ڈگری کلاسوں کے لئے مخصوص ہوا تو دونوں اسلامیہ کالجوں (ریلوے روڈ اور سول لائنز) کے درمیان اساتذہ کا بھی بٹوارہ ہوا۔ شعبۂ تاریخ میں کل دو استاد تھے اور وحید قریشی صاحب جونیئر ہونے کے سبب ریلوے روڈ کے اسلامیہ کالج سے منسلک کئے گئے۔ اسی دوران میں ایک دن پروفیسر حمید احمد خاں (مرحوم) کے گھر پر ایک میٹنگ ہوئی جس میں کالج کے مسائل کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔

ایک یہ مسئلہ سامنے آیا کہ مولانا علم الدین سالک مرحوم سول لائنز میں آنا نہیں چاہتے تھے اس کے برعکس وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے منسلک ہونا پسند کرتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ صدر شعبۂ فارسی کی جگہ کیسے پُر کی جائے۔ گفتگو کے دوران میں کسی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ڈاکٹر وحید قریشی اُستاد تو تاریخ کے ہیں مگر فارسی کے ایم اے اور پی ایچ ڈی ہیں اگر انہیں شعبۂ فارسی میں لے لیا جائے اور وہ ادھر آنا منظور کر لیں تو یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ یہ تمام کام کیسے ہوا یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن چند دنوں بعد ڈاکٹر وحید قریشی اسلامیہ کالج سول لائنز میں بطور صدر شعبۂ فارسی وارد ہوئے۔ جلد ہی انہوں نے اردو میں بھی یونیورسٹی کی ڈی لٹ کی ڈگری لے لی اور یوں وہ یونیورسٹی میں فارسی سے اُردو میں منتقل ہو گئے۔ یوں انہوں نے تاریخ سے فارسی، فارسی سے اردو تک سے ایک ہفت خواں سر کئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی فقرے بازی تو مشہور ہے لیکن اسلامیہ کالج میں ان کے برجستہ فقرے بہت مشہور ہوئے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب فارسی کی کلاس پڑھا رہے تھے ایک لڑکا کہیں سے ایک چھوٹا سا پلّا لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز بلند ہوتی تو وہ پلّے کو مارتا۔ پلّا بے اختیار باؤں باؤں کرتا۔

ڈاکٹر صاحب نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ وہ طالب علم کون سا ہے۔ بے اختیار کھڑے ہوئے، لڑکے کو آواز دے کر کہا۔

"ارے سالے یہاں کیوں لائے ہو آفس میں لے جاؤ"

"کیوں جی؟" لڑکے نے خلافِ توقع ڈاکٹر صاحب کا جملہ سن کر استفسار کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "لے جاؤ لے جاؤ یہ لو کمیشن مل جائے گا"

کالج میں ششماہی امتحان ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کاپیاں لڑکوں میں تقسیم کیں اور کہا۔

"سب لوگ اپنے اپنے رول نمبر ونا لکھ دو"

"پیو دا ناں وی؟" کسی لڑکے نے شرارتاً پوچھا۔

"ہاں اگر کوئی ہو تو" ڈاکٹر صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود "حساس" یاروں کے یار اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ جس شدت سے یاری نبھاتے ہیں اسی شدت سے دشمنی بھی کرتے ہیں۔ لیکن اب عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یاری دوستیاں زیادہ اور دشمنیاں کم ہو گئی ہیں۔ آدمی بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے تو پکے پھل کی طرح ملائم اور میٹھا ہو جاتا ہے۔ سو ڈاکٹر وحید قریشی میں بھی محبت زیادہ ہو گئی ہے۔ اب وہ دوستوں کے بارے میں زیادہ باتیں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی انتھک کام کرتے ہیں۔ خود بھی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کراتے ہیں۔ مقتدرہ کے صدر نشین تھے تو کتابوں کے انبار لگا دیئے تھے۔ بزمِ اقبال کے ڈائریکٹر ہیں تو بھی کتابوں پر کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ اقبال پر جو کچھ رسالوں میں کالج کے میگزینوں میں بکھرا پڑا تھا ڈاکٹر صاحب کی بدولت کتابی صورت میں اکٹھا ہو گیا ہے۔

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کے بھی کرتا دھرتا ڈاکٹر وحید قریشی ہی ہیں۔ اور اسی طرح وہاں بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر وحید قریشی کے حوالے سے ادھر بھی کتابوں کے انبار لگ رہے ہیں۔ جتنی کتابیں ڈاکٹر وحید قریشی طبع یا شائع کرا رہے ہیں اتنی تو کتابوں کے اشاعتی ادارے بھی شائع نہیں کرتے۔ گویا ڈاکٹر وحید قریشی اس لفظ دشمن معاشرے میں بنجر پن کے خلاف لڑنے کے لئے لفظوں کی فوج تیار کر رہے ہیں۔

میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ اگر وحید قریشی شاعر، ادیب، نقاد، محقق اور استاد نہ ہوتے تو بہت بڑے سیاستدان ہوتے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ دوستی اور رفاقت مستقل ہونے والی چیز نہیں۔ کل کے دشمن آج کے دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا وحید قریشی کے انسانوں سے روابط بدلتے رہتے ہیں اور وہ اس سے پریشان نہیں ہوتے اسے زندگی کی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی یاروں کے یار ہیں۔ مجھے خود اس کا تجربہ ہے۔ میں ایسے مہربانوں کو جانتا ہوں جو اپنی ناک کے آگے دیکھنے سے قاصر ہیں لیکن وحید قریشی جن لوگوں کے دوست بنے ہیں۔ انہیں مختلف صورتوں سے نوازتے ہیں۔

مجھے ان کے مشوروں سے بہت سے عملی فائدے ہوئے۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے آخری چند برسوں میں ڈاکٹر وحید قریشی کے مشوروں پر عمل کر کے میں نے بہت سے امتیازات حاصل کئے۔ اس کے لئے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید اور نفسیات

انور سدید

ایک طویل عرصے تک ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کو بہت شکی کا عمل قرار دیا جاتا رہا ہے اور یہ بات کچھ غلط بھی نہیں تھی کہ انہوں نے جو تنقید نگاری کا آغاز کیا تو اس سفر کے پہلے قدم پر ہی شبلی نعمانی جیسے نقاد اور ادیب کے ذہنی محرکات کی تلاش شروع کر دی اور اس سیاحت میں ڈاکٹر وحید قریشی داخل کے نادریافت جزیروں میں بہت دور تک بلا رکاوٹ نکل گئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے پیش نظر یہ بات تھی کہ فن شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور ظاہری الفاظ اور پیش پا افتادہ معانی کے پردے میں حقیقی معنی اور اس کا پس منظر پوشیدہ ہوتا ہے اور کلید ہاتھ آجائے تو ایسے تمام شخصی اور اجتماعی محرکات تک رسائی ممکن ہوتی ہے جو انسان کے لاشعور میں نیم مدہوش حالت میں پڑے رہتے ہیں لیکن کسی خود فراموشی کے لمحے میں ایک زندہ کردار کی تخلیق میں شامل بھی ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ عمل شعوری ہے لیکن ادبی تخلیق کا بہت سا حسن اس لاشعوری عمل میں ہی پنہاں ہے اہل نظر اس پارۂ فن کے جمالیاتی زاویوں کو سراہتے ہیں لیکن نفسیات کا علم رکھنے والے نقاد انہی وسیلوں سے تخلیق کار کی شخصیت کے داخلی محرکات اور پوشیدہ گوشوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی ہمارے ان اولین نقادوں میں سے ہیں جنہوں نے جدید نفسیات کو ادب میں کامیابی سے استعمال کیا اور بعض ادبی عقائد کی ہیولائی تبدیل کر دی۔ ان کا مقالہ شبلی کی حیات معاشقہ ادبی دنیا میں ایک ایٹم بم کی طرح گرا اور بحث و نظر کا طوفان پیدا کر دیا۔ لیکن اب جب کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور فرائیڈ کے نظریات پر نئے نظریات نے سبقت حاصل کر لی ہے اور جنسیات کا موضوع ایسا موضوع نہیں ہے جس سے بوڑھیاں پردہ کریں تو ڈاکٹر صاحب کے حذف کردہ معرکہ آرا مقالے کے بارے میں بھی آراء کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے۔ ابتداء میں اس مقالے کو شبلی کی ذات پر ایک خوفناک حملہ شمار کیا گیا تھا لیکن اب یہ حقیقت متعدد بار تسلیم کی گئی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے شبلی کو ایک صحت مند انسان کی نظر سے دیکھا اور ان کے ہاں ایک فطری انسان کے جنسی ردعمل کی نشاندہی کی۔ چنانچہ ریاض احمد نے لکھا

شبلی کی حیات معاشقہ میں اگرچہ تحلیل نفسی کے اعتبار سے کوئی خاص رجحان مولانا شبلی کے ہاں تلاش نہیں کیا گیا لیکن ایک معمولی اور صحت مند جنسی ردعمل کو جس طرح اس مقالے میں اُجاگر کیا گیا ہے وہ نفسیاتی سوجھ بوجھ کی مثال ہے۔

ہمارے ہاں تنقید میں نفسیات کو استعمال کرنے کی ایک رسم سی پڑ چکی ہے کہ پہلے فرائیڈ کے نظریات کو اپنی خام صورت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور بعد میں شخصیت اور فن پارے کی تفہیم میں فرائیڈ کے نقوش پا کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض ناقدین نے نفسیات کی چند مقبول عام اصطلاحات سے اپنی تنقید کو تسکین دیتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی نفسیاتی تنقید میں نفسیات ضمنی یا رسمی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے فرائیڈ کو حوالہ بنائے بغیر شخصیت اور فن پارے کی تفہیم کی کاوش کی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں علامتوں اور استعاروں کی تجزیہ کاری کا عمل چنداں مرعوب خاطر عمل نہیں تھا۔ انہوں نے نفسیات کو اپنا وژن وسیع کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔

چنانچہ ایک عام انسان تو حقیقت کی صرف ایک سطح پر ہی رسائی حاصل کر سکتا ہے اور یہ ظاہری کی سطح ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے نفسیاتی وژن کی معاونت سے داخل کے جزیروں کی سیاحت بھی کی ہے اور ایک کشادہ نقطۂ نظر کو بروئے کار لا کر نئے نتائج بھی دریافت کئے ہیں۔

اس ضمن میں اہم بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے صرف فرائیڈ اور ایڈلر کے نظریات سے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے معنوی طور پر ینگ کے نظریات کو بھی اپنے فکر کے عقبی دریا میں جاگزیں ہونے کی اجازت دی ہے چنانچہ جب وہ ادب اور تاریخ کے مختلف ادوار کا تجزیہ کرتے اور اصناف ادب کی داخلی ماہیت کو منکشف کرتے ہیں تو ان کے اجتماعی لاشعور کا عمل دخل نمایاں نظر آتا ہے۔ عہد سرسید کا تجزیہ، اردو میں مزاح نگاری کی اہمیت کا تعین کرنے، پاکستانی قومیت، تشکیل نو، پنجابی اردو کے لسانی اور تہذیبی رابطے اور پاکستان میں اردو ادب، فنون لطیفہ اور اسلام جیسے مضامین میں بھی انہوں نے ملک، قوم، ادب اور ادیب کے اجتماعی شعور سے رابطہ قائم کیا ہے اور ایسے نتائج دریافت کئے جن میں ماضی کی دھڑکن بھی موجود تھی اور حال کا آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ ان کا یہ طریقہ اتنا غیر روایتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ نفسیات سے کوئی استفادہ نہیں کیا ہے لیکن در حقیقت نفسیات کا تاثر اور ردعمل ان کی تنقید میں معلوم ہوتا ہے۔

مجھے یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ بعض لوگوں نے اب یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وحید قریشی کے ہاں نفسیات کا استعمال ابتدائی دور تک محدود ہے اور شبلی پر معرکہ آرا مضمون کے بعد انہوں نے اس علم سے استفادہ ترک کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نفسیات کی جدید تحقیق سے اب بھی استفادہ کر رہے ہیں لیکن اس علم سے صرف شخصی یا اجتماعی محرکات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں نفسیات انہیں نیچے تک پہنچنے کا راستہ دکھاتی ہے لیکن ادبی فیصلے میں انہوں نے اپنے ذوقِ جمال کو ہی راہنما بنایا اور نقاد کے بنیادی کردار کو نفسیات میں گم نہیں ہونے دیا۔ ان کی یہ عطا بے حد اہم ہے۔

امکانِ تازہ

[illegible]

وحید قریشی

مجھے کچھ ایسا لگتا ہے یہاں کچھ ہونے والا ہے
میرے خاموش قاتل نے عذابِ جان میں ڈالا ہے

سمٹ کر زندگی نے اک نیا رستہ نکالا ہے
یہ ہی شاید مقدر ہے یہ ہی اپنا حوالہ ہے

شبِ رفتہ میں دل نے راستہ روکا تھا ہستی کا
بڑا طوفان اُٹھا تھا جسے مشکل سے ٹالا ہے

دلِ زندہ ترے جذبوں کی شدت کام آئی ہے
وگرنہ اور کس نے زندگی کو سنبھالا ہے

ابھی جینے کی خواہش چٹکیاں لیتی ہے سینے میں
دلِ مضطر کے صدقے زندگی کا بول بالا ہے

ابھی اہلِ ہنر سے رسم و راہ دوستی بھی ہے
ابھی اہلِ وفا کے ہاتھ میں اُلفت کی مالا ہے

میری معذوریاں حائل نہیں ہیں میرے رستے میں
ابھی رونق ہے بستی میں ابھی گھر میں اُجالا ہے

O

O

کوئی تو نیند سے جاگے غزل کرے املا
علی کمیل کوئی راستہ نیا دکھلا

کہیں تو رات ہی بھیگے کہیں تو دل بہلے
سُنا سُنا شبِ ہجراں کوئی تو گیت سُنا

زمین اپنی ہی گردش میں گم ہے مدت سے
وہ تیرگی ہے کہ جینے کا حوصلہ نہ رہا

فلک سے آگے تو گیسوؤں کا اک سمندر ہے
بھٹک رہی ہے اسی میں غزل کی اک مالا

نگاہِ شوق نہیں گردوپیش سے آگے
زمانہ ارض عجم کے لئے ہے ایک خلا

ہم اپنے ساتھ عذابوں کا بوجھ لے کے چلے
کہ چاند پر بھی توانائی کا رہا جھگڑا

جمی ہوئی ہے ابھی کائی ریگِ صحرا پر
کہ اگلے سال ہی پگھلے گا برف کا تودہ

دہانِ تیر میں ایٹم کے چند ذرّے تھے
رواں ہے وادی و صحرا میں خوف کا دریا

O

O

ہم نے کچھ دن زندہ رہنے کا ارادہ کر لیا
یعنی فرطِ شوق میں کچھ کچھ زیادہ کر لیا

جن کی روپوشی سے قائم تھیں حکایت وفا
اہلِ دنیا نے اُنہیں کو بے لبادہ کر لیا

جس کی خاطر ہم نے ساری زندگی برباد کی
سفر یاروں نے خود ہی پا پیادہ کر لیا

خود کو کر لیں گے اسیرِ جام و بادہ ایک دن
بیٹھے بیٹھے یار لوگوں نے ارادہ کر لیا

زندگی کو یوں بسر کرنا کوئی آساں نہ تھا
سوچتے ہیں کس لئے آخر زیادہ کر لیا

ہم حسابِ بیش و کم میں دیر تک اُلجھے رہے
کرنے والے نے تو پل بھر میں ارادہ کر لیا

عمر بھر اس کو رہی ہے بےلبادہ بستیوں کی تلاش
شیخ نے خود کو اسیرِ جام و بادہ کر لیا

زندگی نے سانس لینے کی ہمیں مہلت نہ دی
زندگی کو پیس کر ہم نے بُرادہ کر لیا

O

O

گلی گلی میں اصولوں کی جنگ جاری ہے
دریچے بند ہیں سارے کہ سنگ باری ہے

اُٹھو ندائیں سناؤ سکوتِ شب ہے ابھی
کہ مومنوں کے لئے یہ بھی رات بھاری ہے

نئی بساط بچھی ہے نئے نئے مہرے
سنا ہے شاہ کی گردش میں پھر سواری ہے

یہ کون آیا ہے تلوار لے کے بستی میں
پرندے پوچھ رہے ہیں کہ کس کی باری ہے

رُکو رُکو کہ ابھی تک قضا نہیں آئی
ابھی نہ جاؤ کہ دنیا ابھی ہماری ہے

چڑیلیں رات کے استھان پر ہیں نوحہ کناں
یہ کیسی شب ہے یہاں کیسی آہ و زاری ہے

ہر ایک شخص ہراساں بہ ظلمتِ شب ہے
ہر ایک شخص کے پردے میں خوف طاری ہے

جہانِ تازہ ہے اپنے سراب میں غلطاں
شبِ سیاہ کا ظلم و ستم تو جاری ہے

ابھی تو محملِ گل ہے طلسمِ زارِ حیات
نتیجہ آپ ہی نکلے گا' پاؤں بھاری ہے

اُداس بچے جو بیٹھے ہیں تنگ گلیوں میں
انہیں بھی اپنے عزیزوں کی انتظاری ہے

O

o

امن عالم ہے آج کل دشوار
فاختائیں ہیں در پے آزار

موسم آیا بیان بازی کا
مومنوں کو نویدِ فصلِ بہار

اپنی تعریف، غیر کی توصیف
یہ ہی شعر و ادب کے شہکار

رند و عابد میں ٹھن گئی شاید
آ رہی ہے صدائے مارا مار

وقت پہ لمحہ رخ بدلتا ہے
کون تھامے گا وقت کی رفتار

آپ کس کس سے لڑ کے جیتیں گے
ساری دنیا ہے در پے آزار

ڈیل والا مکر بھی سکتا ہے
بے نظیرو ذرا رہو ہشیار

o

o

کیا خبر تھی آخرِ شب یہ گھڑی بھی آئے گی
دوستوں کو داستانِ دل سنائی جائے گی

کتنے جلوے ذات کے اندر دکھائے جائیں گے
دل کے اندر کی خلش باہر کہاں تک آئے گی

نارسائی کا گلہ کرنے سے یارو فائدہ
زندگی آخر کو اپنا آپ تو دکھلائے گی

دل یہ کہتا ہے یہ منظر بھی کبھی تم دیکھنا
چلتے چلتے نبض دل بھی خودبخود رُک جائے گی

ہم اگر دیوار گریہ بھی اٹھائیں گے تو کیا
جوئے خوں میں کون سی بندش کھڑی رہ پائے گی

ٹوٹنے کا جو عمل رُک رُک کے چلتا ہے ابھی
تیز تر ہونے لگا تو موت بھی شرمائے گی

میں کہ اپنی ذات میں امکانِ تازہ ہوں وحیدؔ
میرے نشانوں پر بھی اک زندگی اُگ آئے گی

o

فلسفۂ خودی کے بعض عمرانی پہلو

ڈاکٹر وحید قریشی

علامہ اقبال اسلام کو (اس کے دیگر پہلوؤں سے صرفِ نظر کے بغیر) ایک عالم گیر سماجی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کی مدد سے انسانی زندگی کی معاشرتی اساس میں تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی اصولوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انسانیت نے اپنی بنیادی بقا کے لیے جتنے تعینات وضع کر رکھے ہیں اسلام انہیں توڑ کر ان میں ایسی وسعت پیدا کر دیتا ہے جو زندگی کے دنیاوی پہلوؤں سے ماورا کا احاطہ کر لیتی ہے۔ رنگ، نسل، قوم اور وطن کے تنگ دائروں سے بلند ہو کر بنی نوعِ انسان کی فلاح کے لیے اسلام ہی ایک قابلِ عمل معاشرے کی تشکیل کا ضامن ہے۔ فرد، معاشرے کی روحانی اساس ہے۔ اس اعتبار سے فرد اور معاشرہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ روحانی اقدار کے تحت مادی حقائق کی نشوونما در اصل اس وحدت کی تلاش کا عمل ہے جو حیات و کائنات کو ان کی تمام تفصیلات سمیت ایک ترکیبی مجموعہ رہتی ہے۔ اس سطح پر پہنچ کر فرد کی داخلی زندگی، اس کی خارجی زندگی کے ساتھ وہ تعلق پیدا کر لیتی ہے جس کے استحکام پر انسانیت کا مستقبل موقوف ہے۔ اس اعتبار سے یہ عمل وحدت میں منتقل ہونے کا عمل بھی ہے اس لیے کہ روحانی ترقی اور مادی پیش رفت ایک ہی کل کے دو پہلو ہیں۔ گویا توحید مابعد الطبیعاتی ایک معاشرتی اور اخلاقی تصور بن جاتا ہے اور "انا" (خودی) کا وہ رخ سامنے آتا ہے جسے اقبال نے لاالحق کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے کہ

اگر فردے بگوید سرزنش
اگر قومے بگوید ناروا نیست

خدائی حاکمیت کا تصور معاشرے کی حاکمیت میں اس وقت متشکل ہوگا جب معاشرہ روحانی اور دینی اقدار کا پابند ہوگا۔ اس لحاظ سے "اسرارِ خودی" فرد کی داخلی زندگی کی تراش خراش کا لائحۂ عمل ہے تو "رموزِ بے خودی" اس کی خارجی زندگی کی ہمواری و استواری کا جامع پروگرام ہے۔ یہی نظام فکر عالمی سماجی نظام کی تشکیلِ نو کا ضامن بھی ہے۔ علامہ خود فرماتے ہیں:

"The object of my Persian poem is not to make out a case for Islam; my aim is simply to discover a universal social reconstruction and in this endeavour, I find it philosophically impossible to ignore a social system which exists with express object of doing away with all the distinctions of caste, ran or race; and which, while keeping a watchful eye on the affairs of this world, fosters a spirit of unworldliness so absolutely essential to man in his relations with his neighbours"

اسلام وہ واحد معاشرتی نظام ہے جس میں وسعت پذیر ہو کر عالمی معاشرہ بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ فرد ہو یا معاشرہ دونوں کی تشکیل یکساں بنیادوں پر ہوتی ہے۔ انسانی تکمیل کا سفر ایک ہی راستے پر ہوتا ہے جس میں فرد اور نوع کے امتیازات ایک محدود قیمت رکھنے کے باوجود اس حقیقی وحدت کو مجروح نہیں کرتے جس کا دائرہ ایک طرف تو انسان کی تمام جہات تک پھیلا ہوا ہے اور دوسری جانب عقیدۂ توحید کی عملی تصدیق بھی اس سے فراہم ہوتی ہے۔ اقبال جس فکری روایت کے نمائندے ہیں اس کی رو سے حیاتِ انسانی کی حقیقت کا تعین اس عالم سے ہوتا ہے جو وحدتِ کلی کی طرف پیش قدمی کا تقاضا کرتی ہے۔ سماجی سطح پر بھی یہ اصول وحدتِ انسانی شخصیت کی نشوونما میں اہم ترین ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا ست
کاروانش را درا از مدعا ست

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است....

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز
از شرابِ مقصدے مستانہ خیز

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ
ماسوا را آتشِ سوزندۂ....

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

زندگی ہر سطح پر حرکت و عمل کا نام ہے جس میں نت نئی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ایک کشمکش، ایک پیکار مسلسل جاری ہے۔ اگر انسانی حرکت کے اس کائناتی اصول کو بامقصد اور بامعنی نہ بنایا جاتا تو یہ ایک ہمہ گیر انتشار بن کر رہ جاتا۔ یہ انسان ہی ہے جو قانونِ تغیر سے متصادم ہوئے بغیر اس سے وہ

نتائج تخلیق کرسکتا ہے جو حصولِ کُل کے لیے درکار ہیں۔ اقبال کے نزدیک زمان و مکاں کا مسئلہ مسلمانوں کے ہاں موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ مکاں سے زماں تک کا سفر متواتر جاری ہے جو روحانی ارتقا کا بھی ضامن ہے۔ زندگی کی حقیقی معنویت اسی سفر میں پوشیدہ ہے جو انسان کو اس 'مکانیت' کا شکار نہیں ہونے دیتا جس میں محصور ہو کر وجود اپنی تکمیل کے امکانات سے محروم ہو جاتا ہے۔ موت گویا مکانی ٹھہراؤ ہے اور زندگی زمانی بہاؤ۔

اے مسافر جاں بمیرد از مقام
زندہ تر گردد ز پرواز مدام

اسی زاویۂ نظر کی بنا پر علامہ نے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو کے عمل میں تصوف کے ان عناصر کو رد کر دیا ہے جو بے عملی، ترکِ دنیا اور جمود کی دعوت دیتے تھے۔ "اسرارِ خودی" میں ایسے تمام رجحانات کو غیر اسلامی قرار دیا اور ان کی شدید مخالفت کی۔ ان رویوں نے چونکہ وحدت الوجود کے مسئلے میں عقیدے کی شکل اختیار کر لی تھی لہٰذا توحید کی اس غیر قرآنی تعبیر کو خاص طور پر ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ علامہ کی رائے میں اسلامی تصوف تزکیۂ نفس کے قرآنی معیارات اور اخلاق بالعمل کے مسنون نمونوں کا پیرو ہے اور اللہ تک پہنچنے کے لیے صراطِ مستقیم سے انحراف نہیں کرتا جو کتاب و سنت کی ترا شیدہ ہے۔ اسی لیے علامہ خالق اللہ کے ویدانتی تصور کو قبول نہیں کرتے بلکہ انسانی صفات کو برقرار رکھتے ہوئے خدائی صفات پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ "اسرارِ خودی" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو وجودی صوفیہ کے حلقوں میں شدید ردِعمل کا اظہار کیا گیا اور اقبال کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ یہ مخالفت علمی سے زیادہ جذباتی تھی اس لیے مثبت نتائج نہ پیدا کر سکی۔ اس زمانے کے بیشتر وجودی صوفیہ چونکہ اقبال کے فکری پھیلاؤ کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انہوں نے حافظ وغیرہ کی آڑ لے کر ایسا خلطِ مبحث پیدا کر دیا کہ اس مثنوی کا مقصود اوجھل ہو گیا اور ضمنی بحثوں نے زور پکڑ لیا۔

"اسرار و رموز" میں دراصل اقبال کے مثالی فرد اور معاشرے کا ظہور ہوا ہے۔ وہ اسلام کو ایک سماجی حرکی قوت قرار دیتے ہیں جو روحانیت اور مادیت کی مغائرت ختم کر کے انہیں ایک وحدت بناتی ہے جس کا اصل اصول 'توحید' ہے۔ یہاں ظاہر و باطن، نفس و آفاق، زمان و مکاں، فکر و عمل اور روح و مادّہ کے امتیازات تحلیل ہو کر ایک حقیقی کُل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ اس توحیدی سفر کی منزل ہے جس سے حیاتِ انسانی اپنے مقاصد اور غایات کا تعین کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے درمیان حقیقی تعلق کی تلاش اور تنظیم کی جائے۔ انسان کی تخلیق کا منشا بھی تھا کہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی نیابت کا حق ادا کرے۔ اسی لیے اسے احسنِ تقویم قرار دے کر اسے اشرف المخلوقات شمار کیا گیا۔ یہ شرف کوئی استحقاق نہیں ہے بلکہ ایک ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلسل جد و جہد اور پیکار لازمی ہے۔

نوعِ انسانی چھوٹی چھوٹی خودیوں کا مجموعہ ہے۔ "اسرارِ خودی" کے طبعِ اوّل کے دیباچے میں علامہ نے خودی کی توضیح کرتے ہوئے اسے 'تعینِ ذات' اور 'وحدتِ وجدانی' یا 'شعور کا روشن نقطہ' قرار دیا:

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است

'احساسِ نفسی'، 'وحدتِ وجدانی'، 'شعور کا روشن نقطہ' اور 'تعینِ ذات'..... یہ جملہ تراکیب خودی کے ایک ایک پہلو کی نشان دہی کرتی ہیں۔ میں یا 'انا' ایک مجرد تصور ہے مگر شعور اور ارادے کی ہر فعلیت اس کے اثبات پر منحصر ہے۔ بقولِ اقبال:

"یہ خودی یا 'انا' یا 'میں' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی......."

خودی کا یہ تحقق فلسفیانہ تقاضا نہیں ہے بلکہ اخلاقی مطالبہ ہے۔ یہاں حقیقت کی عقلی تحلیل کی بجائے اس کی عملی تحسین درکار ہے تا کہ آدمی اُس نظام کا فعال حصہ بننے پر قادر ہو سکے جو زندگی کے ارتقائی مراحل کی نقش گری کرتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنی ذات اور نوع کے اس اوّلین اور اساسی تعین کو ایسی مقصدی حرکت کا حامل بنائے کہ انفسی و آفاقی تبدیلی کا ہر اصول یا تو خودی سے متشکل ہو یا اس کے ساتھ ہم آہنگی رکھتا ہو۔ اس کے لیے خودی کی تراش خراش ضروری ہے تا کہ ان مقاصد کا حصول ہو سکے جو ایک اعلیٰ سطح پر اس کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ اقبال نے تربیتِ خودی کے تین مرحلے بتائے ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ اطاعت بندگی کی صورت ہے، ضبطِ نفس مشق ہے اور نیابتِ الٰہی بندگی کی تکمیل بھی ہے اور اس کی جزا بھی۔

فرد واحد کے روحانی اور مادی ارتقا کے لئے پہلی منزل اطاعت قرار دی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے قرآن پاک کی آیاتِ کریمہ سے یہ نقطہ لیا ہے۔ انسانی تربیت کا پہلا مرحلہ اطاعت قرار پایا ہے۔ اطاعتِ خدا اور رسول دونوں کی اطاعت۔ جس میں عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ علامہ کے نزدیک عشق سے مراد مقصد کے حصول کی لگن بھی ہے اور عشقِ رسول بھی۔ عشقِ رسول کا مطلب اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے اور اس طرح عشقِ رسول عشق

خداوندی تک جاپہنچا ہے جب کوئی فرد اپنے عقاید و خیالات میں پختہ ہو جاتا ہے تو اس کے بعد دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس کا ہے جب انسان غور و فکر کرنے لگتا ہے حدود و قیود کا احساس کرتا ہے اپنے آپ کو جذباتیت کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ وہ فکر و عمل میں بصیرت سے کام لیتا ہے یہ معرفت کا مقام ہے۔ ان دو مرحلوں کے بعد تیسرا تکمیلی مرحلہ ہے جس میں انسان نیابتِ الٰہیہ کا حق دار بن جاتا ہے یہ انکشافِ ذات کا مرحلہ مکمل ہوا ہے تو انسان مردِ مومن مردِ حر بن جاتا ہے یہی مرحلہ فکری اور روحانی تکمیل کا ہے جس کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ رسول پاک کی ذات ہے۔ انسانِ کامل کا یہ تصور مردِ مومن کی اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہے اسی کو آگے چل کر اقبال نے جاوید نامے میں فقر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے لیکن اسرار و رموز میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ جاوید نامے کے بعد علامہ اقبال نے مسلسل فقر کی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔

علامہ نے خاص طور پر خودی کے حوالے سے اپنی فکر کا سرچشمہ سورۂ اخلاص کو قرار دیا ہے۔ یہ سورۂ مبارک اللہ تبارک و تعالیٰ کی وحدت محض کا معجزانہ بیان ہونے کے ساتھ ساتھ وحدتِ امت اور اتحادِ فکر و عمل کا حکم بھی ہے۔ وحدت اللہ کا وہ رنگ ہے جو ملتِ مسلمہ پر نہ چڑھے تو اس کا وجود مشتبہ ہو جائے گا۔ "قل ھو اللہ احد" کا مطالبہ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب مسلمان انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس توحید کو منعکس کریں جو ذاتِ باری تعالیٰ کا خاصہ ہے:

رنگ او برکن مثالِ او شوی - در جہاں عکسِ جمالِ او شوی...
وارہاں نامیدہ را از نامہا - ساز باخم درگذر از جامہا....
با یکی ساز از دوئی بردار رخت - وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت...
یک شو و توحید را مشہود کن - غائبش را از عمل موجود کن

توحید ان معنوں میں وحدت کی تلاش کے علاوہ وحدتِ فکر (Integrated Vision) کی تشکیل کا عمل بھی ہے تا کہ اسلامی تہذیبی و معاشرتی قوت کا اظہار ہو سکے۔

خودی کی شخصی و نوعی یکتائی کے بعد اس کے دوسرے تشکیلی عنصر کی سند "اللہ الصمد" سے ملتی ہے یعنی بے نیازی۔ اللہ کے بے نیاز ہونے کا مطلب ہے کہ سب اُس کے محتاج ہیں اُسے کسی کی حاجت نہیں۔ یہ شان صمدیت ملتِ اسلامیہ میں یوں ظہور کرتی ہے کہ مسلمان اللہ کے سوا کسی کی احتیاج نہیں رکھتا جبکہ دیگر اقوام و ملل اپنی ہدایت و فلاح کے لیے مسلمانوں کے محتاج ہیں۔ غیرت اور خودداری اس مطلوبہ بے نیازی کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں جو فرد اور قوم میں ایک ایسی بلندی پیدا کرتے ہیں کہ دنیا و مافیہا کی طرف وہ کشش کم ہو جاتی ہے جس کا شکار ہو کر انسان اپنی حقیقی تکمیل کے وسائل فراہم کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے:

گر بہ اللہ الصمد دل بستہ ای - از حدِ اسباب بیروں جستہ ای...
بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است - رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است...
از پیامِ مصطفیٰ آگاہ شو - فارغ از اربابِ دون اللہ شو

آیۂ "لم یلد و لم یولد" کے حق کا ظہور ان تمام حد بندیوں کو منہدم کر دیتا ہے جن کا مرکزی نقطہ جسم یا مادہ ہے جسمانیت یعنی نسبتوں کا اصول بے طور اس ترفع کی سائی نہیں رکھتا جو انسان کو حقیقی معنوں میں موجود ہونے کے لیے درکار ہے علاوہ ازیں body principle اقلیم کثرت سے منقطع نہیں ہو سکتا اور کثرت بھی ایسی جس کا ہر جز دوسرے سے متصادم ہو۔ اس آیت کی تفسیر میں اقبال ایک بلند معنوی آہنگ کے ساتھ ملتِ مسلمہ کی مثالی وحدت کے سرچشمے کی نشان دہی کرتے ہیں:

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یکدگر پیوستہ ایم

رشتۂ ما یک تولائش بس است
چشمِ ما را کیفِ صہبائش بس است.....

عشقِ او سرمایۂ جمعیت است
ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است.....

ملتِ او مثلِ او نورِ حق است
ہستیِ ما از وجودش مشتق است....

ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد لم یولد است

"ولم یکن لہ کفواً احد" کا ربانی دعوا امتِ محمدیہ سے اس طرح منعکس ہوتا ہے کہ اللہ کی بے ہمتائی پر وحدتِ ایمان اور اس کے فیضان سے یہ امت بھی بالقوہ بے مثل ہے اپنے اس جوہر کو کھلا آشکار کرنے کے لیے اسے حالات کے مسلسل تغیر کی لگام اپنے ہاتھوں میں رکھنی ہوگی اور دنیا پرستی

کے پورے نظام کو منتج کرتا ہوگا۔ یہ تربیتِ خودی کا بنیادی نکتہ ہے جسے ہدف بنائے بغیر انسانی انا، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، حیاتیاتی حدود سے بلند ہو کر اسلامی تعین کو قبول نہیں کر سکتی۔ اسی سے مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی کردار کا نصب العین متعین ہوگا۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے سب سے پہلے فرد کی روحانی ترقی لازم ہے جس کے لیے علامہ نے تربیتِ خودی کے تین درجے مقرر کیے ہیں۔ جن کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں، یعنی: اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہیہ... "خطبات" میں انہوں نے ان مراحل کو جدید فلسفیانہ زبان میں یوں بیان کیا ہے:

(۱) Faith (ایمان)

(۲) Thought (فکر)

(۳) Discovery (انکشاف)

گو کہ علامہ نے انہیں مذہبی زندگی کے تین ادوار سے تعبیر کیا ہے تاہم تفصیلی تجزیے کے بیشتر نتائج ایمان اور اطاعت، فکر اور ضبطِ نفس اور انکشاف اور نیابتِ الٰہیہ کو ایک فلسفیانہ رو سے تقریباً ہم معنی ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود اقبال ان تینوں ادوار کی جو توضیح کرتے ہیں وہ "اسرارِ خودی" میں مذکور تربیتِ خودی کے سہ گانہ مراحل کی یاد دلاتی ہے۔

In the first period religious life appears as a form of discipline which the individual or a whole people must accept as an unconditional command without any rational understanding of the ultimate meaning and purpose of that command. This attitude may be of great consequence in the social and political history of a people, but is not of much consequence in so far as the individual's inner growth and expansion are concerned. Perfect submission to discipline is followed by a rational understanding of the discipline and the ultimate source of its authority. In this period religious life seeks its foundation in a kind of metaphysics - a logically consistent view of the world with God as a part of that view. In the third period meta physics is displaced by psychology, and religious life develops the ambition to come into direct contact with the Ultimate Reality. It is here that religion becomes a matter of personal assimilation of life and power; and the individual achieves a free personality, not by releasing himself from the fetters of the law, but by discovering the ultimate source of the law within the depths of his own consciousness.

اسرارِ خودی جب شائع ہوئی اور اس کا انگریزی ترجمہ چھپ کر آیا تو بعض شرق و غرب کی اصطلاحات کی وجہ سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ جن کی وضاحت علامہ نے بعض خطوط میں کی ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط مرقومہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء میں لکھتے ہیں:

On the Sufi doctrine of the Perfect Man more than twenty years ago, long before I had read or heard anything of Nietzche.

نطشے کا سپرمین دراصل Shiva کا غیر مابعد الطبیعیاتی مظہر ہے جو اس نئے دائرے میں تخلیق و تخریب کا وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں 'موجود ہوا' 'معدوم کرنے' کا اظہارِ قوت کا دوسرا نام ہے۔ نطشے کا کمال یہ ہے کہ اس نے وجود کے کائناتی سانچوں کو توڑ دیا اور صورت و معنی کا ایک نیا اتحاد ایجاد کیا۔ گو کہ اقبال کا مردِ کامل بھی اسی "روحِ آغاز" کا حامل ہے جو سپرمین میں نظر آتی ہے مگر اقبال نے اس کے لیے کچھ ایسے حدود مقرر کر دیے ہیں جو حقیقی ایجابیت پر دلالت کرتے ہیں۔ سپرمین اور مردِ کامل بعض یکساں عناصر سے تشکیل پانے کے باوجود اپنی تکمیلی حالت میں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہو جاتے ہیں۔ نطشے کو اپنے افکار (Originality) پر ناز تھا جبکہ اقبال شدت سے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ میری فکر کی بنیاد قرآن اور مسلمان صوفیہ و حکما پر استوار ہے۔ نطشے بھی انسان کو کائنات پر غالب کرنا چاہتا ہے اور اقبال کی بھی یہی آرزو ہے تاہم جرمن فلسفی کا اثباتِ انا نفیِ غیر سے مشروط ہے جبکہ علامہ وجودِ غیر سے خوف زدہ نہیں بلکہ اس کے لیے بھی وہی اسلوبِ اثبات تجویز کرتے ہیں جس سے خودی کا تحقق ہوتا ہے۔

اقبال کے بنیادی تصورات کو ایک وسیع تقابلی فضا میں دیکھنے کی ضرورت ابھی کما حقہ پوری نہیں ہوئی۔ ان کے اصولی امتیازات قطعیت کے ساتھ واضح نہیں ہیں۔ ہمیں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا ہے۔ فکر کے تقریباً تمام نظام (disciplines) منقلب ہو گئے ہیں۔ ایسے میں اقبال کی relevance کو از سرِ نو ثابت کرنا ہوگا لیکن اس کام کی ابتدائی تیاری کہیں نظر نہیں آتی۔ ہم نے اس مضمون میں "اسرار و رموز" کے حوالے سے انسان کے بارے میں حقائق کی اس نئی ترکیب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس کے دو بنیادی عناصر ہیں، ایک مابعد الطبیعی اور دوسرا عمرانی۔ اقبال کی نظر میں اس ترکیب کی اصل توحید ہے جس کی الوہی جہت مابعد الطبیعی ہے اور انسانی پہلو عمرانی۔ توحید کی حقیقی معنویت ان دونوں کے امتزاج میں پوشیدہ ہے۔ انسانی میڈیم کو نظر انداز کر کے وحدتِ الٰہیہ کے اطلاقی ظہور کا مشاہدہ اور اثبات کیا ہی نہیں جا سکتا۔ عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی زندگی کی ہر سطح پر اس کا مظہر بن جائے۔ یہی فکرِ اقبال کا جوہر ہے جس کا پہلا تفصیلی اظہار "اسرار و رموز" میں ہوا۔

☆

اردو ڈائجسٹ کی سالگرہ

ڈاکٹر وحید قریشی

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم جس رسالے کی پچیسویں سالگرہ منا رہے ہیں اس کا مدیر اپنی پندرھویں سالگرہ منانے میں مصروف ہے۔ الطاف حسین قریشی جوان بلکہ نوجوان ہیں۔ ان میں جوانی کی مستعدی بھی ہے اور حالات سے دست و گریباں ہو جانے کا حوصلہ بھی۔ وہ سیاسی تجزیوں میں خوفناک حد تک صاف گو اور بے تدبیری کی حد تک جرأت مند ہیں۔ صحافی نہ ہوتے تو سیاست دان ہوتے کیونکہ وہ سیاست دانوں کے سارے گُن جانتے ہیں۔ تحریری اثر پیدا کرنے کے لیے اختر شیرانی اور ان کے معاصرین کا رنگ استعمال کرتے ہیں اور موقع ملے تو قلم کی بجائے تلوار سے بھی کام لے گزرتے ہیں۔ وہ پہلے درجے کے دہشت گرد ہیں۔ ان کا کوئی سا تجزیہ اٹھا دیکھیے' کوئی سا انٹرویو پڑھ جائیے۔ قریشی پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بہت خوفناک بلکہ حوصلہ شکن باتیں کہہ جاتے ہیں اور ان بھیانک روداروں کو پڑھ کر قاری بے چارہ سہم سہم جاتا ہے اور اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ آج کل میں یہ مملکتِ خداداد پاکستان ضرور کسی آفت میں مبتلا ہونے والی ہے۔ قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ قربِ قیامت کے یہ مناظر اکثر سچ نکلتے ہیں۔ اسی حسنِ اتفاق کو الطاف حسن قریشی اپنا کارنامہ اور حقائق کا صحیح ادراک سمجھتے ہیں اور اس پر نازش کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ہماری بھی ہوئی دس بارہ باتوں میں سے دو چار تو سچ ضرور نکلتی ہوں گی۔ لیکن ہم نے کبھی اس بنا پر کبھی اپنی لیاقت اور ذہانت کا دعویٰ نہیں کیا۔ الطاف حسن قریشی حق گوئی کی پاداش میں ایک دو بار جیل بھی جا چکے ہیں۔ اس کی خبر ہمیں یوں لگی کہ دوست احباب ان کے جیل جانے پر ہم سے آ کر اظہارِ ہمدردی کرتے رہے۔ ہم کہ ایک عرصے تک اردو ڈائجسٹ میں مضامین لکھتے رہے اور ہمارے بعض قارئین اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے رہے کہ الطاف حسن قریشی' اعجاز حسن قریشی کے تیسرے بھائی وحید قریشی ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ سب قریشی ایک جیسے یا ایک ہی قسم کے قریشی ہوں۔ خون میں شامل ہونے والے جملہ قائی جس حساب سے بڑے قائی کے بھائی بند ہیں بس ہمارا اور قریشی برادران کا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم نے اکثر کوشش کی کہ اس غلط فہمی کا فائدہ اٹھا کر قریشی برادران کی جائداد پر دو چار ہاتھ ماریں۔ لیکن افسوس آج کا ادیب بڑا ہی بے فیض ہے فریب دیا جاتا ہے فریب کھایا نہیں جاتا۔

خاندانی مشابہت سے قطع نظر ہمیں اسی مشابہت کے بھی کئی نادر موقعے ملے ہیں۔ جب تک لاہور میں قیام رہا فیروز سنز کے ڈاکٹر عبدالوحید کے کارنامے ہمارے نام سے منسوب ہوتے رہے۔ اسلام آباد میں ہماری جاسیاں ڈاکٹر وحید الزماں سمیٹ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خاں کا نامۂ اعمال فرشتے اکثر کابینہ ڈویژن کے آفتاب احمد خاں کے حساب میں درج کر دیتے ہیں۔ اردو کی ایک ادیبہ نے تو یہاں تک کمال کر دکھایا کہ جب بھی ہمارا تعارف کسی سے کرایا یہی کہا کہ یہ مولانا وحید الدین سلیم ہیں۔ اس سے بہرحال کوئی خاص فرق نہیں پڑتا' سوائے اس کے کہ تاریخ کا معاملہ ذرا سا چوپٹ ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا معاملہ کچھ ایسا توجہ طلب بھی نہیں۔ تاریخ آج تک ہمارے کسی کام نہیں آ سکی حتیٰ کہ ہم نے اس سے عبرت کا سبق بھی نہیں لیا۔ آخر تاریخ میں کیا رکھا ہے۔ ہم اسے پچھلے چالیس برس سے برابر مسخ کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن پھر بھی زندہ ہے اور اس کی تاریخ بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔

تاریخ کا ذکر چلا ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ قریشی برادران یہاں بھی باز نہیں آئے۔ تاریخ کے ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ برابر جاری رہتی ہے۔ اردو ڈائجسٹ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں تاریخی حقائق کے بعض ایسے گوشے ظاہر ہوئے جنہیں بڑی قومیں ہمیشہ چھپا کے رکھتی ہیں اور وقت قیام ہونے پر واٹر گیٹ سکینڈل کہتی ہیں۔ ہمیں چھوٹی قوموں کی صف میں کھڑا کر کے مشرقی پاکستان میں سر اٹھانے والے حالات کی پہلے سے خبر دے دیتے ہیں۔ ہمیں ان کے کہے کا یقین نہیں آیا اور صرف اس کی تصدیق کے لیے ہم آدھا ملک دے دینے پر آمادہ ہو گئے۔ تاریخی حقائق کی تصدیق کا یہ بڑا مہنگا سودا تھا جو قریشی صاحب کی خاطر ہمیں برداشت کرنا پڑا۔ اسی طرح بھارت کی دو جنگوں کی روداد کے پس پردہ حرکات کے طول طویل سلسلے بھی قریشی صاحب کی جولانگاہ خاص ہیں۔ کوئی دھر لیتا تو سرکاری راز فاش کرنے کے الزام میں دھر لیا جاتا۔ شروع شروع میں قریشی صاحب بھی ایک آدھ بار سچ بول کر داخل زنداں بھی ہوئے تھے لیکن بڑے لیڈر اور بڑے صحافی عموماً اپنی گرفتاری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی اسیری اور رہائی سے انہیں نیک نامی ملی اور ان کی دھاک پہلے سے زیادہ بیٹھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بڑے دانش مند بلکہ دانشور کہلائے اور پھر گرفت میں آئے سرکاری راز اگلنے کا اسلوب انہیں معلوم ہو گیا۔

ہماری رائے میں الطاف حسن قریشی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کے تازہ شمارے میں انہوں نے آپریشن جبرالٹر پیش کیا ہے اور پوری قوم کو کشمیر کے محاذ پر آئینہ دکھایا ہے ہم اصل میں کیا ہیں اور ہمارا ظاہری روپ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تو آپریشن جبرالٹر ہی میں پنہاں ہے۔ قومی تضادات کو بیان کرنے کے لیے پتھر کا جگر چاہیے۔ اس راز کو پندرہ بیس برس سینے میں دبائے رکھنے کے لیے تو لوہے کے اعصاب درکار ہیں جو خال خال ہی میسر آتے ہیں۔

اردو ڈائجسٹ کے ریوٹ میں یہ توانائی غالباً اس طویل دوڑ کا نتیجہ ہے جسے الطاف حسن قریشی ''صبح کی سیر'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ تو اب پرانی بات ہے آج کل وہ یہی توانائی ملکوں ملکوں کی سیر سے کشید کرتے ہیں۔ پی آئی اے کا طیارہ ہر وقت ان کے پاؤں کے ساتھ بندھا رہتا ہے کبھی سعودی عرب، کبھی لبنان، کبھی فلسطین، کبھی مصر، کبھی عراق، کبھی امریکہ اور کبھی انگلستان.... جغرافیہ یاد کرنے کا اس سے زیادہ سستا طریقہ دریافت نہیں ہوا لیکن ایک بات اہم ہے کہ اتنا اونچا اُڑنے کے باوجود وہ اپنا ماضی نہیں بھولے جبھی تو ان کا ہر اداریہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے سے شروع ہوتا ہے پرانے زمانے میں اس طرح کی پیشہ ورانہ کاری گری کو اساتذہ ''مضمون کا چہرہ باندھنا'' کہتے تھے۔ ہمارے قریشی صاحب تو بعض اوقات چہرہ باندھنے کی بجائے مضمون کی پوری ''رسم دستار بندی'' تک ادا کر جاتے ہیں۔

حضرات!

اردو ڈائجسٹ میں سیاست دانوں کی پگڑیاں اچھالنے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے جاسوسی ناول کے ترجمے، روش کی درون خانہ کشمکش، مزاحیہ مضامین، شاعری، کتابوں پر تبصرے اور اشتہارات۔ بارہ مصالحے کی چاٹ اردو میں اپنی طرز کی پہلی چیز تھی جس کے قارئین اردو ادب نہیں اردو کے عام خواندہ افراد ہیں چنانچہ پاکستان میں اس کی نقل میں کئی ڈائجسٹ اُبھرے اور ڈوبے۔ اردو ڈائجسٹ کی ناؤ بھی ابھرتی ڈوبتی رہی ہے لیکن قریشی برادران قریشی ہونے کے ناطے سے تجارت کا ڈھنگ بھی جانتے ہیں۔ وہ قارئین کی نبض پہچانتے ہیں اس لیے ہر آن نئی نئی تبدیلیوں کی مدد سے اپنی کشتی کو بھنور سے باہر نکال لاتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر ذوق اور ہر پسند کا مال موجود ہے میرے ایک دوست اردو ڈائجسٹ محض اس لیے خریدتے ہیں کہ وہ صرف اشتہار پڑھنے کے عادی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس رسالے میں اگر اس رنگ کا سوبر خواندگی اس وافر مقدار میں موجود ہے تو باقی صفحات کی کل تعداد کیا ہوتی ہو گی؟.... مجھے اس کا جواب نہیں آتا میں ہمیشہ ریاضی میں کمزور رہا ہوں۔

جذبِ سلیم

قاری شا

ڈاکٹر وحید قریشی ہماری علمی اور ادبی روایت میں ایک کثیر الجہات شخصیت ہیں جن کی تحقیق کا دائرہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ آپ ممتاز پاکستانی دانشور، تنقید اور تحقیق میں منفرد اسلوب رکھنے والے ادیب، استاذ شاعر اور اقبالیات کے نامور محقق ہیں۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ محترم ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبالیات سے منسوب مقالات کو مدون کرنے کی خدمت میرے سپرد کی جو میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔

ڈاکٹر وحید عشرت

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی تصنیف "اردو ادب کا ارتقا" کی خوبی یہ ہے اس میں پنجاب میں پیدا ہونے والے اردو ادب سے بحث کر کے اس کے خصائص و شمات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ ادب اپنے مزاج اور کاوروں میں دہلی اور لکھنؤ کے ادب سے کس طرح مختلف تھا اس کی نشاندہی عمدگی سے کی گئی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر وحید قریشی اردو زبان و ادب کے انتہائی معروف محقق، دانشور، ماہر تعلیم، نقاد، ادیب، شاعر، تاریخ دان اور تاریخ شناس ہیں۔ انہوں نے تصور پاکستان کی اساس بننے والے نظریہ پاکستان تحریک پاکستان اور اس سے وابستہ متنوع عوامل اور ردِعمل سے جنم لینے والے سیاسی مدوجزر کو تجزیہ اور فکری انداز میں "پاکستان کی نظریاتی بنیادیں" کے نام سے جو مضامین سپردِ قلم کئے ہیں وہ نہ صرف تاریخ دانوں بلکہ علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا یہ کارنامہ ان کے بہت سارے بڑے کارناموں میں ایک معتبر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

مجھے ڈاکٹر وحید قریشی کا پہلا شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میں ان معدودے چند خوش نصیبوں میں بھی شامل ہوں جو جاگتی ہوش و حواس میں حکیم خود کہیں پیدل چلتے، بیڈمنٹن کھیلتے، سائیکل چلاتے دیکھ چکے ہیں۔ علامہ اقبال سے کسی نے استفسار کیا کہ دنیا میں سب سے مشکل چیز کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا "ذہن سازی"۔ ڈاکٹر وحید قریشی میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ شاگردوں کے علمی رجحان کو بھانپ کر ان کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ عطا فرمایا ہے کہ ان کی صحبت میں رہ کر ذہن خالص اسلامی اور انسانی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

ارشد میر

ڈاکٹر وحید قریشی کا شمار ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہوتا جو بدلتے موسم کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ یہ تو اس قبیلے کے سرخیل ہیں جو آندھیوں اور طوفانوں کے سامنے دیوار بن کر اس وقت تک کھڑے رہتے ہیں جب تک آندھیوں اور طوفانوں کا دم نہیں ٹوٹ جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کے علم اور شخصیت کے بارے میں جب بھی خیال کرتا ہوں تو بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کے متعلق قرآنی آیت ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔

ترجمہ: "اللہ نے علم بھی زیادہ بخشا ہے اور تن و توش بھی خوب عطا کیا ہے"

کرم حیدری

ڈاکٹر وحید قریشی کا شمار ان معدودے چند محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے تحقیق کو تنقید اور تخلیق کے مقام اتصال کا شعور دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے محض تنگی اور دوربینی کے وظیفے کو جس طریق پر برتا اور عام کیا ہے اس سے تحقیق اور تنقید خاص طبقے سے نکل کر عام طبقے میں آ گئی ہے۔ آپ کی سخت جانی اور مسلسل استغراق نے تخلیقی رویوں کو بھی نئے ہنر اور نئے ذائقوں سے آشنا کیا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز راہی

ڈاکٹر وحید قریشی جیسا عالی ظرف اور عالی نسب کرم فرما کم کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ انہوں نے بعض مقالوں میں یہ تک تحریر کر دیا ہے کہ فلاں موضوع پر طالب علم کی واقفیت اور جان کاری مجھ سے زیادہ ہے۔ ایسا حوصلہ کم از کم میری نظر سے کسی صاحب علم یا صاحب نظر کا اپنی بابت ابھی تک نہیں گزرا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک ڈاکٹر صاحب کے علمی اور ادبی کارناموں کی بابت کچھ بھی تحریر نہ کر سکا۔

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نہایت اعلیٰ درجہ کی دیانت اور امانت کے آدمی ہیں ان کے اس بلند معیار اور کڑے اوزان کے باعث بعض حضرات کو ان سے شکایتیں بھی پیدا ہوئیں مگر جو شخص اپنے کردار کی تعمیر میں اپنے مفادات کو پس پشت ڈالنے کا عادی ہو وہ بھلا دوسروں کے لئے اپنی اخلاقیات کیوں

مجروح کرے، اُنہوں نے انہیں بلند اوصاف کے تحت بے شمار نوجوان اہلِ قلم کی رہنمائی کر کے انہیں بلند مقام تک پہنچایا بلکہ جن علمی اور ادبی اداروں کی رہنمائی کا فریضہ ڈاکٹر وحید قریشی نے انجام دیا انہیں بھی انتہائی بلندیوں تک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اکبر حمیدی

1946ء میں جابر علی سید کے توسط سے ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات اور نیاز مندی آج تک قائم ہے۔ وحید قریشی عالمِ شباب میں بھی دوستوں اور ہم عصروں میں سب سے نمایاں ہوا کرتے تھے۔ گفتگو کا موضوع ادب، تنقید، عروض اور علم بیان و علم بدیع یا اردو، انگریزی شاعر ہوتا تو آخری سند وحید قریشی کی رائے کو ہی عطا ہوتی۔ ان کی گفتگو میں علم و ادب فروانی کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی بھی جوبن پر ہوا کرتی تھی۔

محمد کلیم خان

ہمارے ہاں بہت کم اہلِ قلم ہیں جو تعمیری انداز فکر رکھتے ہیں۔ ایسے پر آشوب دور میں ڈاکٹر وحید قریشی کا مسکراتا ہوا چہرہ، دھیما لہجہ، گفتگو کی روانی، بلیغانہ انداز، متاثر فطرت کو اپنے اندر سمونے کی کوشش، تحقیق، تنقید، تنظیم تخلیق میں بلا کی جستجو، اشتیاق اور معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کا عزم ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

عابد کمالوی

غالب اور متعلقات غالب کے حوالے سے تمام مقالات غالب کی حیات و کلام کے کسی نہ کسی گوشے کو نئی روشنی عطا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے تفہیم غالب کے سلسلے میں جس قدر جامع اور بنیادی کام کیا ہے شاید ہی اس سے پہلے کسی نے کیا ہو۔ غالبیات پر ڈاکٹر وحید قریشی کا کام بلاشبہ ہمارے ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

رعنا فاروقی

اُستادِ محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی کے بلند ثقافت اور لسانیات دونوں میں معقول اور مشہور ادیب، شاعر، محقق، نقاد، ماہرِ تعلیم اور علم و ادب کے ایسے شاور ہیں کہ جن کی گھنی چھاؤں میں ان گنت و لاتعداد کمزور و ناتواں پودے تناور درخت کا روپ دھار چکے ہیں۔ آپ کے ہاں زبان و بیان کی تازگی اور توانائی کے ساتھ فکر علمی کی بے پناہ روانی اور جولانی بڑے سے بڑے پتھر کو تراش کر ہیرا بنا دیا کرتی ہے۔ میں جب بھی خود کو ڈاکٹر صاحب محترم کے شاگرد کے طور پر دیکھتا ہوں تو اپنے آپ پر فخر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

قلبِ صمیم

حمد باری تعالیٰ

غالب عرفان

زندگی کیا ہے ترے حسن کی رعنائی ہے
تیرے ہی قرب کی مخلوق تمنائی ہے

ظلمتیں چیر کے جو روشنی ہم تک پہنچی
یہ کرم تیرا ہی' دراصل توانائی ہے

خاک کا پُتلا کہاں اور کہاں اک انساں
تیری بخشش میں یہ مٹی کی پذیرائی ہے

آئنہ خانے میں ہوں قید تو تیری وحدت
دل کے آئینے میں خاموشی سی در آئی ہے

زندگی ختم ہو تو ایک حیاتِ ابدی
جس کو مل جائے وہی تیرا شناسائی ہے

ہے ازل تا بہ ابد سارے زمانوں پہ محیط
لمحے لمحے میں تری انجمن آرائی ہے

صرف رنگوں میں نمایاں نہیں تیرا جلوہ
پھولوں میں خوشبو بھی تو نے ہی تو مہکائی ہے

کہکشاؤں کے تسلسل کا نظامِ عرفاںؔ
کتنا مربوط' ترا حلقۂ گیرائی ہے

O

نعت رسول مقبولؐ

سجاد مرزا

نکہتِ شہرِ نبیؐ ' راحتِ جاں ہوتی ہے
حسرتِ دید مرے دل میں جواں ہوتی ہے

روح سرشار ہو اور جسم کی تطہیر بھی ہو
ایسی کیفیتِ جاں' کہتے ہیں' واں ہوتی ہے!

ہر قدم پہ ہے وہاں دعوتِ نظارۂ نُور
کیا تجلّی ہے جو آنکھوں پہ عیاں ہوتی ہے

جب بھی سوچا ہے کہ توصیفِ پیمبرؐ لکھوں
اس گھڑی میری طبیعت بھی رواں ہوتی ہے

انؐ کے جب شہر میں پہنچوں گا تو پھر دیکھوں گا
جو زمیں' پیاری زمیں رشکِ جناں ہوتی ہے!

دل میرا واقعی پھر شاداں و فرحاں ہو گا
منزلِ مقصود' محبت کا نشاں ہوتی ہے

پھر تجھے آقا و مولا نے بلایا ہے وہاں
تجھ سی تقدیر بھی سجاد کہاں ہوتی ہے؟

O

سخنِ معریٰ

محمودالحسن

رات دن اشکبار ہیں آنکھیں
کیا کوئی آبشار ہیں آنکھیں

دل کی صورت بھی دیکھ لو ان میں
دل کی آئینہ دار ہیں آنکھیں

آپ کو بھی خیال آتا ہے!
آپ سے ہمکنار ہیں آنکھیں

لالہ وگُل ہیں آنکھ کے دھوکے
روزنِ نو بہار ہیں آنکھیں

اُن کے ہوتے حسین لگتی ہیں
ورنہ گرد و غبار ہیں آنکھیں

یہ تو مصروفِ ناز تھیں کل تک
آج کیوں شرمسار ہیں آنکھیں

وہ ہیں آنکھوں کے سامنے پھر بھی
جانے کیوں بےقرار ہیں آنکھیں

چشمِ بینا نہیں ہے ویسے تو
ہر جگہ بے شمار ہیں آنکھیں

O

سیدمشکور حسین یآد

دیکھنا نہیں آساں ناگہاں کا پس منظر
ہرگزرتا لمحہ ہے جاوداں کا پس منظر

ہر قدم پہ منزل ہے ایک تازہ مشکل ہے
ہر قدم بدلتا ہے کارواں کا پس منظر

دیکھ کر زمینِ شوق جھک گئی جبینِ شوق
آسمان پر اُترا آسماں کا پس منظر

ایک آئنے میں ہم دیکھتے ہیں دونوں کو
ساتھ ساتھ چلتا ہے جسم وجاں کا پس منظر

کوئی حد نہیں ملتی اپنی حد کی سرحد سے
بےکراں کراں جیسے بیکراں کا پس منظر

کوئی ہے کہانی میں مستقل روانی میں
پیش پیش رہتا ہے داستاں کا پس منظر

ہم یہیں نہیں ہوتے ہم کہیں نہیں ہوتے
آگے پیچھے رہتا ہے درمیاں کا پس منظر

ہے چمن برائے بیت ورنہ اصل میں تو یآد
بجلیاں ہیں طوفاں ہے آشیاں کا منظر

O

محسن احسان

ہر ابتدا کی کہیں انتہا تو ہوتا ہے
سمندروں کو جزیرہ نما تو ہوتا ہے

ہمیشگی کا گماں اس قدر رہا ہے کہ دل
سمجھ رہا ہے اسے کیمیا تو ہوتا ہے

محبتوں کی عبادت پہ کیسا پچھتاوا
گنہگاروں سے کارِ خطا تو ہوتا ہے

دلوں میں گردِ کدورت تو اڑتی رہتی ہے
ان آئینوں کو غبار آشنا تو ہوتا ہے

ہے میرے بازو پہ ماں کی دعاؤں کا تعویذ
مجھے یقیں ہے کہ ردِ بلا تو ہوتا ہے

میں شکلِ تازہ بہشتِ ہنر کا ہوں محسن
ثمر جمالِ سخن کا عطا تو ہوتا ہے

O

انور سدید

یہ اوپر سے اشارا آ رہا ہے
زمانہ پھر ہمارا آ رہا ہے

جو آتا تھا ہجومِ دوستاں میں
وہی محفل میں تنہا آ رہا ہے

سمندر سے کہو اپنی خبر لے
مقابل اس کے دریا آ رہا ہے

مجھے طوفان کا خطرہ نہیں ہے
مری جانب کنارہ آ رہا ہے

مجھے اب تیرگی کا ڈر نہیں ہے
نظر روشن ستارا آ رہا ہے

ترے قد سے بہت لمبا ہے انورؔ
ترے پیچھے جو سایا آ رہا ہے

O

مرتضیٰ برلاس

سچ تو یہ ہے بے حسی کا تم نے جب طعنہ دیا
ہم تو غافل تھے مگر تم نے ہمیں چونکا دیا

کس کی گردن پر لکھا جائے گا ان لوگوں کا خوں
کہ بنامِ امن جن کو جنگ میں مروا دیا

صرف سایوں کے تعاقب میں گذاری زندگی
آج تک ہم نے بھی اپنے آپ کو دھوکا دیا

اس ہجوم نفسا نفسی میں ہے یہ اپنی مثال
جس طرح تاریک ویرانے میں اک جلتا دیا

جو بھی دنیا سے ہمیں دکھ سکھ کی صورت میں ملا
ہم نے دنیا کو وہی کچھ شعر میں لوٹا دیا

جس کی نسبت سے تمہیں دنیا میں پوچھا گیا
تم ذرا سوچو کہ تم نے اس زمیں کو کیا دیا

O

کرشن کمار طور

کتاب عشق میں سارا بیاں وصال کا ہے
میں زندہ ہجر میں ہوں اور گماں وصال کا ہے

ہم ایسے فرق تعلق سے خود بھی حیراں ہیں
زمیں ہے ہجر کی اور آسماں وصال کا ہے

عجب تضاد کے پیش نظر ہوں ہستی میں
ہے دھوپ ہجر کی اور سائباں وصال کا ہے

ہے جاگنے پہ ہی پڑتا تمام چابک ہجر
ہوں آنکھیں بند تو سارا سماں وصال کا ہے

چلو یہ ہجر سہی کچھ تو دسترس میں رہے
جو وقت آتا ہے وہ بھی کہاں وصال کا ہے

غرض سے چپ ہیں مگر اہل دل سمجھتے ہیں
کہ لفظ ہجر سے روشن بیاں وصال کا ہے

کشید کرتے ہیں عرفان اپنے ہجر سے طوؔر
یہ خط چھوڑ کے سارا جہاں وصال کا ہے

O

جاوید شاہین

مرا بھی حصہ غنیمت کے مال میں رکھ دے
پھر اس کمائی کو رزقِ حلال میں رکھ دے

بسر کروں جنہیں جب چاہوں اپنی مرضی سے
کچھ ایسے دن بھی مرے ماہ و سال میں رکھ دے

مہ و نجوم جہاں ہیں بدل چکا ان کی
ستارہ ہجر کا ماہِ وصال میں رکھ دے

نکلنے والا ہو دن جب یہاں تو دُور کہیں
اک اور شہر میں اس کو زوال میں رکھ دے

یہ رُت بدلنے پہ مٹی کی تازہ خوشبو ہے
اِسے لپیٹ کر سبزے کی شال میں رکھ دے

بنانا ہے اگر ظالم زمستاں میرے لیے
ذرا سی برف بھی بادِ شمال میں رکھ دے

کچھ ایسا کر کہ ترا عہد سب کو یاد رہے
دروغ گوئی کو کسبِ کمال میں رکھ دے

حدوں کو توڑ دے اُس حسن کی ستائش میں
چمکنے والی ہر اک شے مثال میں رکھ دے

یہی کہ صحبتِ شاہیں سے دُور رکھ خود کو
مبادا ذات تری شک کے جال میں رکھ دے

O

جلیل عالی

ہم سخن ہونا بھی اب دشوار ہو گا
ریشمی لہجہ ترا تلوار ہو گا

سوچنے نکلو تو یہ بھی دھیان رکھنا
کون سے رخ سوچنا بے کار ہو گا

جس کو خوش آتی نہیں باتیں ہماری
اس کا بھی اپنا کوئی معیار ہو گا

ترکِ شوقِ بے نہایت کس طرح ہو
ایسی لذت کا کوئی آزار ہو گا

جس کو خود سے بھی چھپاتے پھر رہے ہو
کل وہی شہ سرخیِ اخبار ہو گا

اک کشش دن رات دل کو کھینچتی ہے
جانے کیا منظر افق کے پار ہو گا

O

علیم صبا نویدی

نظر، فکر، احساس، لب نور میں
اتر آئے ہیں سب کے سب نور میں

نہ سردی، نہ کہرا، نہ شبنم، نہ دھوپ
مرا گھر ہے گویا عجب نور میں!

سیاہی سے ہم کو نہیں واسطہ
ہمارا اپنا ہے نام و نسب نور میں

ذرا گرتے لفظوں کو چن لیجئے!!
ہیں بھیگے ہوئے مرے لب نور میں

مرے فن کا عکسِ جمیل
نہا کر جو آئے گی شب نور میں

O

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

یہ وصف ہمسفری ہے نظر میں رکھا جائے
وفا کا حوصلہ شرطِ سفر میں رکھا جائے

ستم بھی ٹوٹے تو دہلیزِ ظلم پہ نہ جھکے
عطا ہو سر تو یہ سودا بھی سر میں رکھا جائے

شکست دینا ہے طوفاں اٹھانے والوں کو
ہمارے ساتھ سفینہ بھنور میں رکھا جائے

تیرا کرم ہو تو ہم چھو لیں آسمانوں کو
یہ زور ٹوٹے ہوئے بال و پر میں رکھا جائے

وہ دوستانِ شہر ہیں کہ دشمنانِ بشر
یہ عقدہ ناخنِ عقلِ بشر میں رکھا جائے

عبدالرحمن عبد

شکست گاہ، یہ تقصیر اپنی ہی تھی
میرے پاؤں میں زنجیر اپنی ہی تھی

میں خدا جانے کیا دیکھ کر ڈر گیا
آئینے میں تو تصویر اپنی ہی تھی

میں نے مڑ کر جو کی زندگی پہ نظر
خواب اپنے تھے تعبیر اپنی ہی تھی

جانے میں نے کیوں نہ سنبھالا اسے
میرے ہاتھوں میں تقدیر اپنی ہی تھی

تھی حریفوں سے یہ بے رخی کس لئے
ان کی توقیر، توقیر اپنی ہی تھی

عبد جس چیز سے جرم ثابت ہوا
وائے قسمت وہ تحریر اپنی ہی تھی

O

غالب عرفان

پرندہ تک نہیں حدِ نظر میں
کہاں ٹھہروں سمندر کے سفر میں

سنہری شام کو ہی ساتھ رکھنا
بدل جاتا ہے موسم رات بھر میں

مری آواز دبتی جا رہی ہے
پھنسا ہوں میں صداؤں کے بھنور میں

کہاں نکلا کہاں ڈوبا ہے سورج
خبر کس کو ہے شہرِ بے خبر میں

خودی یا بے خودیٔ میری کہ اُس کی
یہ دیکھو میری ہر فکر و نظر میں

مہکتی یاد سے آنگن سجا ہے
کوئی آ کر تو دیکھے میرے گھر میں

کھنڈر تاریخ تہہ در تہہ جو دیکھی
عجب تہذیب تھی دیوار و در میں

شعور و فکر سے عرفانؔ جاں تک
تشخص ہے مرے علم و ہنر میں

O

خیال آفاقی

جائے گا کہاں اور مرے دل سے گذر کر
اے عشقِ بلا خیز اسی گھر میں بسر کر

مشاطگیٔ زلفِ خرد بھی ہے ضروری
آئینِ جنوں سے نہ مگر صرفِ نظر کر

تقدیر کا لکھا تو نہیں تیرگیٔ شب
نالے سے شبِ تار کو تابندہ سحر کر

دل خستہ سے غنچے کی خنک آہ کی مانند
اس دور کی بسرگشتہ مزاجی پہ اثر کر

اس خاک کی نسبت کا مقام اور ہی کچھ ہے
یوں لاکھ فلک چاند ستاروں پہ سفر کر

خوشبو کو نہیں ہوتی نمائش کی ضرورت
تو گل ہے تو پھر شہرتِ ارزاں سے حذر کر

ساحل پہ مچلتی ہوئی موجوں کو خبر کیا
میں بھی کسی طوفان سے آیا ہوں گذر کر

یہ بات بھلا تیرے سوا کس کو بتاؤں
کیا ہاتھ مرے آیا ترے دل میں اتر کر

اب تک تو سمجھ میں نہیں آیا ہے کسی روز
بگڑی ہوئی تصویر کو دیکھوں گا سنور کر

پتھر کا زمانہ ہو کہ ایٹم کا زمانہ
بے خوف جہاں مرتے نہیں موت سے ڈر کر

تیشہ ہو کہ کشکول یہ پیشے ہیں پرانے
رہنے دے خیال اور کوئی کارِ دگر کر

صدیق شاہد

ہمارے حال کی یارو انہیں خبر بھی نہیں
اور اپنے پاس خفا کا کوئی ہنر بھی نہیں!

بہت قریب سے آئی ہے نکہتِ گُلِ نَو
یہیں کہیں ہے بہاراں بعید تر بھی نہیں!

کبھی یہ سوچا ہے تو نے کہ دل کے ماروں کا
رہِ امید پہ پہلا سا وہ سفر بھی نہیں

رواں رہتی ہے پانی پہ آنکھ کی کشتی
کہ ایک عمر سے دلدار وہ نظر بھی نہیں!

نگہ کے ہاتھ طلب کی سفارتیں بھیجیں
مگر وہ ایک تغافل کہ چارہ گر بھی نہیں!

وہ دھوپ پھر نہیں اتری ٹھٹھر رہا ہے بدن
ان آفتابوں کو ذروں کی کچھ خبر بھی نہیں

کہا تھا ہم نے تجھے پھر کبھی نہ چاہیں گے
مگر ہمارا کہا ایسا معتبر بھی نہیں!

نگہ کی نرم عبارت بھی کچھ نہیں شاہد
ہرے بھرے سے بدن کا اگر شجر بھی نہیں

O

غلام مرتضیٰ راہیؔ

درخت شاخوں پہ اپنی ثمر اُٹھائے ہوئے
اور اُن کے واسطے ہر سنگ سر اٹھائے ہوئے

جو نفع بخش تھی اُس کو میری معذوری
پھرا کیا وہ مجھے دربدر اٹھائے ہوئے

میں بال بال بچا مہر کی تمازت سے
چلیں ہوائیں غبارِ سفر اٹھائے ہوئے

بشر تھے شاخوں پہ پتوں کی طرح آویزاں
رواں تھا جوش میں دریا شجر اٹھائے ہوئے

کھڑی ہوئی ہے بڑے صبر سے مری دیوار
غمِ شکستگیِ بام و در اٹھائے ہوئے

تمہیں نہ خواب سے بیدار ہو سکے راہیؔ
کھڑی تھی رات، نقابِ سحر اٹھائے ہوئے

تشنہ بریلوی

تپشِ عشق میں کچھ اور نکھر جاؤں گا
ورنہ پھر راکھ ہی بن کر میں بکھر جاؤں گا

جاتے جاتے بھی کوئی کام تو کر جاؤں گا
درد بن کر میں ترے دل میں اتر جاؤں گا

اک معما ہی رہی میرے لئے بزمِ حیات
اجنبی ہوں میں یہاں، لوٹ کے گھر جاؤں گا

عشق بھی مشک صفت ہے مرا چھپتا ہی نہیں
ہر گلی ہو گی معطر میں جدھر جاؤں گا

مجھ سے وہ پوچھتے ہیں "تو نے کبھی دل بھی دیا؟"
اشک کچھ بھی کہیں میں صاف مکر جاؤں گا

میری شوریدہ سری جہدِ مسلسل کا جمال
آئے گا وقت کہ نکھروں گا سنور جاؤں گا

فراغ روہوی(کولکاتا بھارت)

سمندروں سا مسلسل رواں دواں ہی رہا
میں بے کراں تھا سدا سے میں بے کراں ہی رہا

یہ اور بات کہ منزل نہ مل سکی' لیکن
مری اُڑان کا محور تو آسماں ہی رہا

عجب سفر پہ روانہ کیا گیا مجھ کو
کہ ہر پڑاؤ میں درپیش امتحاں ہی رہا

سفر ہمارے لیے باعثِ ظفر نہ سہی
مگر شکست پہ بھی حوصلہ جواں ہی رہا

حسین رُتوں کی میں تصویر کھینچتا کیسے
مری نظر میں تو جلتا ہوا سماں ہی رہا

کسی مقام پہ ہم دل کو زیر کر نہ سکے
وہ حکمراں تھا ہمیشہ سے' حکمراں ہی رہا

اُسے منانے کے سو سو جتن کیے' لیکن
وہ بدگماں تھا کچھ ایسا کہ بدگماں ہی رہا

عبث فراغؔ' اُسے ڈھونڈتا رہا' وہ تو
قریبِ جاں تھا ازل سے قریبِ جاں ہی رہا

O

حفیظ انجم کریم نگری

زمیں داروں کا بیٹا ہوں زمیں داری نہیں کرتا
کہیں پہ نوکری کرتا ہوں معیاری نہیں کرتا

تری تعریف میں دو لفظ میں بھی کھل کے کہہ دیتا
اگر تو میر جعفر بن کے غداری نہیں کرتا

بڑا ہی ناسمجھ بُدھو بُھلیا ہے دلِ ناداں
یہ عیاروں کی دنیا ہے یہ عیاری نہیں کرتا

مجھے مل جاتی ناکامی مجھے کھا جاتی مایوسی!
اگر میں امتحاں دینے کی تیاری نہیں کرتا

مجھے کیوں کام سونپا جا رہا ہے بولئے حضرت
کسی کے گھر پہ جا کے میں وفاداری نہیں کرتا

کماتا ہوں گنواتا ہوں گنواتا ہوں کماتا ہوں
کبھی دولت بچانے کی سمجھداری نہیں کرتا

بظاہر خوب لگتی ہے ہر اک اس کا ہے شیدائی!
مگر میں جھوٹی شہرت کی خریداری نہیں کرتا

میں کوسوں دور رہتا ہوں میں کوسوں دور رکھتا ہوں
میں ایسے ویسے لوگوں سے کبھی یاری نہیں کرتا

مرا ظاہر مرا باطن ہمیشہ ایک رہتا ہے
اداکاری نہیں آتی اداکاری نہیں کرتا!

تجھے اس دور کا انسان کیسے مان لیں انجمؔ!!
ریاکاروں میں رہتا ہے ریاکاری نہیں کرتا!!

ملک زلوہ جاوید

ماجد سرحدی

ہم کو سولی پہ سرِ عام چڑھایا جائے
شرط یہ ہے کوئی الزام لگایا جائے

جن سے تقدیسِ گلستاں ہے تعجب ہے انہیں
پا بہ زنجیر سرِ عام بلایا جائے

یہ صلیبوں کا زمانہ ہے مگر میرے خدا
کوئی عیسیٰ بھی تو اس دور میں لایا جائے

مصلحت کچھ بھی سہی پھر بھی یزیدوں سے کہو
مجھ سے فنکار سے یہ سر نہ جھکایا جائے

اب بھی باقی ہے یہاں رسمِ حسینی ماجدؔ
یہی مژدہ مرے قاتل کو سنایا جائے

رند ساغری

شناخت اپنی نئی اختیار کرتے ہوئے
گزر گیا حدِ منزل غبار کرتے ہوئے

بدل لیا نئی تہذیب نے پرانا لباس
روایتوں کی قبا تار تار کرتے ہوئے

پرانے لوگ جو روپوش ہو گئے تھے کبھی
پلٹ کے آئے ہیں نیزے پہ دھار کرتے ہوئے

عجیب رات ہے سہمے ہوئے ہیں سناٹے
مجھے بھی خوف لگا انتظار کرتے ہوئے

خلا سے آئے گا اب کوئی آشنائے جمال
زمین سوچ رہی ہے سنگار کرتے ہوئے

نہ جانے کون ہے جو چھپ کے مجھ میں رہتا ہے
مرے قریب ہی مجھے فرار کرتے ہوئے

وہ سرد چاند بھی سورج کو ڈھانپ کر خوش ہے
ہماری مجبوری زمیں داغدار کرتے ہوئے

گزر رہے ہیں ساعت سے کھردرے لہجے
رفاقتوں کی حدیں سوگوار کرتے ہوئے

اداسیوں کی امانت تھی رُت جگوں کی تھکن
گزر گئی جو مجھے سنگسار کرتے ہوئے

خلا میں تاروں کی فصلیں بھی پک گئی ہیں اے رندؔ
سحر پہ عارضی موسم ادھار کرتے ہوئے

ارمان نجمی

زرہ کے چاک کو ٹوٹی کماں کو چومتے ہیں
جو بچ رہی ہے ہم اس خاکِ جاں کو چومتے ہیں

لبِ شگفتہ نہ شیریں زباں کو چومتے ہیں
کہ برف ہونٹ تو برگِ خزاں کو چومتے ہیں

گزرتے وقت نے اُن کی شناخت گم کر دی
ہوا کے لب قدمِ رفتگاں کو چومتے ہیں

یہ کیسی خانہ خرابی کا ہے سفر درپیش
ہر ایک گام پہ نقشِ زیاں کو چومتے ہیں

زمیں پہ پاؤں بھی رکھتے ہیں وہ ہماری طرح
خلانورد مگر آسماں کو چومتے ہیں

نظر جھکا کے گزرتی ہے عافیت کوشی
جو سربلند ہیں تیغ و سناں کو چومتے ہیں

لپٹ رہی ہے گلے الوداع کی ساعت
اداس نظروں سے ہم آشیاں کو چومتے ہیں

جو مست حال ہیں وہ کٹ چکے ہیں مٹی سے
جو بے کنار ہیں وہ لامکاں کو چومتے ہیں
O

حسن عسکری کاظمی

میں نے کہا کہ تو مری دھرتی کا پھول ہے
اس نے کہا بجا ہے مگر دل ملول ہے

میں نے کہا کہ زلفِ طرحدار کیا ہوئی!
اس نے کہا سر پہ حوادث کی دھول ہے

میں نے کہا زمانہ مخالف ہے کس لئے
اس نے کہا یہ بات ہی کرنی فضول ہے

میں نے کہا لکھاری کا لکھا ہے بے اثر
اس نے کہا کہ ہر جگہ اس کا دخول ہے

میں نے کہا فرنگ بھی جائے اماں نہیں
اس نے کہا یہ قہر خدا کا نزول ہے

میں نے کہا کہ دشمنِ جاں کے قدم ہی لوں
اس نے کہا غلط یہ کہاں کا اصول ہے

میں نے کہا کہ خوب ترا حرفِ حق بجا!
اس نے کہا کہ دل سے تجھے بھی قبول ہے؟

میں نے کہا حقیقتِ عشقِ بتاں ہے کیا
اس نے کہا یہ دلِ ناداں کی بھول ہے

میں نے کہا خواب ہے یہ کائناتِ غم
اس نے کہا کہ اس میں عرض ہے نہ طول ہے

میں نے کہا کہ دور ہے منزل سے کارواں
اس نے کہا کہ رہبرِ کامل رسول ہے

ایک جہان وہ بھی ہے

مصطفیٰ کریم

رحمت علی کو جمائی آئی اور منہ سے دانتوں سے بدبو اس کی ناک سے ٹکرائی۔ اندھے پیپل کے درخت کے نیچے حبس ویسی ہی تھی جیسی اردگرد۔ اور ہوا بھی گوبر کی بو سے بوجھل تھی۔ رحمت علی کو ننگی چارپائی بدن میں گڑتی محسوس ہوئی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے کپاس کے کھیتوں کے درمیان اسے تین افراد ایک لڑکے کی کمر میں رسی باندھے اسے کھینچتے نظر آئے۔ ان آدمیوں کو پہچاننے میں اسے دشواری نہیں ہوئی۔ سبھی اس کے قبیلے مستوئی کے افراد تھے۔ جلا ہوا سیاہ رنگ، سیاہ مونچھ اور داڑھی ایک دوسرے سے گتھی ہوئی۔

"ان حرامی مستوئیوں پر مستی چھائی ہے جبھی اس چھوکرے کو کھینچتے ہوئے لا رہے ہیں؟" رحمت علی نے سوچا اور اپنی گدلی داڑھی میں چھپے ننھے پھوڑے کو سہلایا۔ اس سے پیپ نکل کر اس کی انگلیوں پر آ گئی۔ جو تکلیف سے ہوئی وہ اس نے برداشت کر لی اور انگلیوں کو اس نے کرتے کے دامن سے صاف کیا۔

وہ لوگ اس کے پاس آ گئے۔ لڑکے کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ آنسو اور پسینے سے اس کا گندمی چہرہ نم تھا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہیں نکلی۔

"سردارو۔ اس لونڈے کا ہاتھ زرینہ کے ہاتھ میں تھا اور یہ ہنس بھی رہا تھا۔"

"کیا؟ اس نیچ ذات ترکھان کی یہ ہمت۔ اس نے ہماری چادر پر ہاتھ رکھ دیا۔" رحمت علی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی گردن کی نسیں زہریلے سانپ کی طرح نمایاں ہو گئیں۔

"تم سب نے اسے کیوں نہیں مار ڈالا۔ تم سب کھوتے ہو کھوتے۔" رحمت علی گرجا۔

"جی کیا کریں خدا کا حکم ہی یہی ہے اور جان لینا یا دینا تو پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔" ان چار آدمیوں میں سے ایک بولا۔ اس کے ساتھیوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سردارو۔ رحم کرو۔ میں نے لکڑی کو چھیل کر ایک مورتی بنائی تھی۔ جنڈی بھری پاس سے جا رہی تھی وہ مورتی دیکھنے کے لیے رک گئی۔" لڑکا گڑگڑایا۔

"سردارو۔ یہ ملا تھا اس سے۔" ایک نے ننھی سی مورتی رحمت علی کے حوالے کر دی۔

"یہ مورتی ہے؟ اس کی شکل تو......" رحمت علی کی آنکھیں ابل آئیں۔

"جی سردارو۔ ہمیں بھی یہی خیال آیا۔" چاروں میں سے ایک فرد بولا۔

"لے جاؤ اس چھوکرے کو۔ اس کے ساتھ وہی کرو جو مرد عورتوں کے ساتھ بستر میں کرتے ہیں" رحمت علی نے حکم دیا۔

لڑکا زاروقطار روتا ہوا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ "سردارو۔ معاف کر دو۔ غلطی ہو گئی۔ پھر ایسا کبھی نہیں کروں گا۔" لڑکا چیخ چیخ کر التجائیں کرنے لگا لیکن رحمت علی نے منہ پھیر لیا۔ ایک نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا اور دوسرے نے پیر اور اسے اٹھا کر کھیتوں کی جانب روانہ ہو گئے۔

"شیرا۔ تو جا کر میرے بھائی بندوں کو لے آ۔ کہنا بہت ضروری کام ہے اور اس لونڈے کے باپ کو بھی ساتھ لانا۔" رحمت علی نے دو آدمیوں میں سے ایک کو حکم دیا۔

کچھ دیر بعد بزرگ مستوئی آ گئے۔ دراز اور پست قد۔ سفید اور سیاہ ریش۔ آنکھیں کھنچی ہوئیں اور غصے سے بھری۔ پاس کے گھروں سے چارپائیاں کھینچ لائی گئیں۔ قریب بیریوں کی جو شکستہ حویلیاں تھیں وہاں کوے کائیں کائیں کرنے لگے۔ ایک دبلا پتلا مریل سا بڈھا لرزتا کانپتا ہاتھ جوڑے آ گیا۔ شیرا اس کے پیچھے پیچھے اکڑتا ہوا آ رہا تھا۔ بڈھے کو دیکھ کر رحمت علی کو محسوس ہوا کہ چارپائی میں مینخیں اگ آئی ہیں۔ وہ غصے سے بیتاب اٹھ کھڑا ہوا اور کڑک کر بولا۔

"دیکھو ادا۔ آج ہماری چادر کو تیرے چھوکرے نے ہاتھ لگایا۔ اس پر بری نظر ڈالی اور گندے اشارے کیے۔" رحمت علی زمین پر پھینکی مورتی کی جانب اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے اشارے کرتا ہوا بولا۔

''ہم ایرانی غریبی سے تنگ آ کر زر کمان بن گئے۔ لڑکا لڑکیاں چھیل کر انسان اور جانور بنانا رہتا ہے۔ میں منع کر دوں گا مورتیاں نہ بنائے'' بڈھا سنایا۔

''تمہیں بے وقوف سمجھتا ہے۔ ستواسے دیکھو۔ وہ زر کمان لوٹا ہماری معصوم بچی کو اسے دکھا کر گندے شعور سے عدہا قتل وارتا۔ آج ہماری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔ ہم چاہیں تو تیرے گھر کی ساری چادریں نکال کر انہیں ادھیڑ دیں پھر انہیں شہر لے جا کر سبھوں کو دکھائیں۔ لیکن ہم ننگی ناعیں کو بازار میں پھرا کر اولیاؤں کے شہر کو گندہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس بستی سے پیر چلے گئے۔ پیر ولا ویران ہو جاتا لیکن ہم نے اسے بسایا۔ ہم صوفی نہیں رہے پرست تو ہیں۔ الاوہ سے دیا لگاؤ نہیں پھر بھی کچھ سبق۔ ہم درویشوں کو بہت ذلیل کیا گیا ہے۔''

''سردارو۔ معاف کر دو۔ غلطی ہوگئی۔ جو سزا دو گے مان لیں گے۔'' بڈھا وحشت علی کے سامنے اور بھی جھک گیا۔

''وہ تو ہم دیں گے۔ پنچ۔ اس کے گھر میں پشمینہ کی جو چادر ہے اس کی چکنائی اور گرمی سے ہمارے گیرو گرم ہوں گے۔''

بھوکے کتوں کو بہت دنوں سے ہڈیاں نہیں ملی تھیں۔ پنچایت کے سارے لوگوں نے اثبات میں زور زور سے سر ہلایا۔ مورتی کو دیکھ کر ان کے بدن میں بھی آگ لگ گئی تھی۔ یہ بالشت بھر کی مورتی نہیں تھی۔ وحشت علی کا تیر درست تھا۔ سبھوں نے پر زور آواز میں سزا کی حمایت کی۔

''سردارو۔ ایسا ظلم نہ کرو۔ ہم بھی دین دار ہیں۔ ہمارے بزرگ پیروں کے پیر دھوتے تھے۔'' بڈھے کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''جاتا ہے سور کہیں۔ لا اس چادر کو جس کا نام تو نے بنا رکھا ہے۔ وہ قسمت والی ہے اس کے خون میں آج مستوں کا خون ملے گا۔ جا جلدی۔ نہیں تو بھیجتا ہوں اپنے آدمیوں کو۔ وہ تیرے گھر سے ساری چادریں نکال لائیں گے۔'' وحشت گرجا اور اپنے پیر سے اس نے جوتا نکالا۔

کچھ دیر بعد وارث روتا اور کانپتا چادر کو لے آیا۔ صدیوں پہلے ایران سے جن غربت کے ماروں نے قطب مینار او رتاج محل کی شہرت سن کر ادھر کا رخ کیا تھا ان کا حسن نسل در نسل قائم رہا۔ چادر پر گلاب اور نرگس کے پھول کھلے تھے۔ سنہری نمبر پر تتلیاں اڑ رہی تھیں۔ وحشت علی نے چار جوان مستوں کو اشارا کیا۔ چادر کی آہ و بکا بلند ہوئی اور آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے اپنے باپ اور بھائی کو مدد کے لیے پکارا۔ اپنے خدا کو دہائی دی لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ ایسے موقعوں پر ارض وسما ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ پیروں کی حویلیوں میں بھی آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ وہاں سے مدت ہوئی سادات اپنی مقدس کتابیں کو سینے سے لگائے رخصت ہو چکے تھے۔ کوری مٹی سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔

چادر کو گھسیٹتے ہوئے چاروں اس کوٹھری میں لے آئے جہاں نہ چھت تھی نہ دروازے اور نہ ہی کھڑکیاں۔ جو دیواریں تھیں وہ اندھی ہو گئیں اور اپنی زبانیں کاٹ لیں۔ پہلا مرد جب چادر کے پاس آیا تو وہ گڑ گڑائی۔

''ویرا۔ میں تیری بہن ہوں۔ میرے ساتھ برائی نہ کر۔''

''چپ رہ۔ ہمارے چچا اور خالہ کی بچیوں سے کیا ہماری شادی نہیں ہوتی' کیا ہم ان کے سامنے ہجڑے ہو جاتے ہیں؟'' مرد بولا اور گلاب و نرگس کے پھولوں کی پنکھڑیوں کو مسلنے لگا۔

جب دوسرا مرد آیا تو چادر کراہتے ہوئے بولی۔

''مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں بھی تیرے گاؤں کی عزت ہوں۔''

''چپ رہ حرام کی جنی۔ نیچ ذات کی عورتیں گاؤں کی عزت ہوتی ہیں؟'' مرد نے جواب دیا اور تتلیوں کے پروں کو نوچنے لگا۔

چادر نے خدا کو یاد کیا۔ اس کے منہ سے کلمہ نکلا' لیکن کچھ کام نہیں آیا۔ چادر کو چاک کرنے والے کے منہ سے نکلی جسم کی غلاظت چادر کے پاک منہ کو ناپاک کرتی رہی۔

چاروں مرد چادر کو ادھیڑ کر چلے گئے۔ بڈھا وارث اپنی قسمت کو روتا اور زمین کے پھٹ جانے کی دعائیں مانگتا کوٹھری میں آیا اور چادر کو سینے سے لگا کر اپنے گھر چلا گیا۔ مرولا میں کوئی کہرام نہیں مچا۔ سرطان زدہ خاموشی چھا گئی۔ چند روز بعد ایک پردیسی اولیاؤں کے شہر میں گرد اور گداؤں سے تنگ آ کر مرولا کی جانب آ نکلا۔ میں خبریں جمع کرتا ہوں۔ اس نے اطلاع دی۔ کسی نے چپکے سے واردات کی خبر اسے دے دی۔ جلد ہی سب کچھ اخباروں میں آ گیا۔ پارلیمنٹ کے دروازے اور کھڑکیاں تڑاخ تڑاخ بند ہونے اور کھلنے لگیں۔ ایک غم زدہ خاتون ریشمی لباس میں مرولا آئی۔ اس کے ساتھ چار فوجی کھڑکھڑاتی وردی میں ملبوس تھے۔ خاتون نے چادر کو چھوا اپنے نرم ہاتھوں کو مشفقانہ اس پر رکھا اور بتایا کہ صدر نے لاکھوں روپے اس کے لیے بھیجے ہیں۔

''میں ان سے اسکول کھولوں گی۔ لیکن جو دنیا مٹا دی گئی وہ تو پھر نہیں مل سکتی'' چادر نے اداسی سے جواب دیا۔

جہنم

شمشاد احمد

رحیم بخش کی نیند جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔

وہ سر سے پیر تک پسینے میں لت پت تھا اور اس کا انگ انگ بج رہا تھا۔

پھر کسی ڈراؤنے خواب نے اُسے ڈسا تھا۔

اُسے غصہ آگیا۔

"دھت تیرے کی..... دن بھوتوں سے چھپ چھپ کر گزارتے ہیں.... سارے رات کو خواب بن کر چلے آتے ہیں۔"

جب سے مل میں چھانٹی کی افواہیں چلی تھیں، اس کی زندگی ایک خوف زدہ دھڑکن بن کر رہ گئی تھی۔

"بچے کیا کھائیں گے، کیسے جئیں گے؟"

اُس نے اپنے بوجھل جسم کو اٹھا کر کروٹ بدلی، سر کے نیچے ہاتھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اُس نے اپنا کیا کرایا اللہ کے سر تھوپ دیا۔

"اُس نے پیدا کیا ہے تو وہی....."

اس کے باوجود اس کی تسلی نہ ہوئی۔

اُس کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔

وہ کھلے میں سو رہا تھا..... لیکن کہیں، کسی طرف بھی روشنی کی کوئی مریل سی چنگاری نہ تھی..... آسمان تک غائب تھا۔ ڈراؤنے خواب کا ستایا خوف دوچند ہو کر غراتا ہوا لوٹ آیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا..... اس کا ذہن کام کرنے لگا۔

اُس نے اپنے آپ کو ڈانٹ لگائی۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟ نظر نہیں آرہا..... بجلی نہیں ہے۔"

وہ چارپائی پر اپنے آپ کو الٹتا پلٹتا رہا لیکن نیند ایسا تھا جیسے کبھی تھی ہی نہیں.....

اچانک اس کا پڑوسی اپنے سفید دانت چمکاتا، اندھیرے کو اتھل پتھل کرتا آیا اور اس کے سرہانے آن کھڑا ہوا۔ وہ صرف اس کی آواز سن سکتا تھا اور اس کے دانت دیکھ سکتا تھا۔

"ایک نہ ایک دن تم میرے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے..... اور سیدھے جہنم میں جاؤ گے..... پڑوسی کو تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے۔"

وہ ہنسنے لگا..... ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

"ہر کوئی سالا جہنم سے ڈراتا ہے، میں نہیں....."

اچانک آگے ہوا کا ایک بگولا آیا اور وہ اس کے اندر تڑپتا ہوا گھومنے لگا۔

اس کی بصارت کی ہوا پھس سے نکل گئی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... وقت ملے گا تو سارے اچھے کام کر لوں گا۔"

اس کے اندر تیز گرم ہوائیں اپنا کام شروع کر چکی تھیں۔

"اس سالے وقت پر بھروسہ کرنا احمق پن ہے..... نجانے کب پھس ہو جائے اور آدمی ادھر کا رہے نہ اُدھر کا۔" وہ کافی دیر تک ذہن کے مدوجزر پر ہچکولے کھاتا رہا..... پھر تیرتا، ڈوبتا ساحل پر اُبھرا۔

"بات تو غلط ہے..... میں ہاتھ منہ باہر گلی میں دھونے کی بجائے اندر بھی تو دھو سکتا ہوں۔"

اس کے اندر جھلاتی، گرم ریت پر پاؤں بدلتی دنیا چاؤں چاؤں کرتی اس پر چڑھ دوڑی۔

شروع سے ایسا کرتا تو ٹھیک تھا..... لیکن اب اگر یہ عادت چھوڑی تو قمر دین اور ساری گلی مجھے بزدل گرداننے لگے گی..... بزدلی کی زندگی.....

وہ گیلی ریت پر رینگتا ساحل پر آگیا۔

"قمر دین کا گھر نشیب میں ہے اور آگے گلی بند ہے، پانی رک جاتا ہے..... اس میں میرا کیا قصور۔"

وہ پھر سے بھٹکنے لگا..... اُسے کوئی راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

اُس نے کروٹ بدلی پھر بدلی۔

"خواہ مخواہ کسی الجھن میں پھنس گیا ہوں..... رات کھنچتی چلی جا رہی ہے..... آنکھ لگ جائے تو....."

لیکن آنکھ لگ کر نہ دے رہی تھی۔

وہ جھنجھلا اٹھا۔

"اگر پانی قمر دین کے گھر کے سامنے جمع ہو جاتا ہے تو اس سے اس کی نیند کا کیا تعلق؟"

لیکن دونوں چیزوں میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔

تنگ آکر اُس نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا۔

"چلو..... کل سے میں ہاتھ منہ اندر ہی دھولیا کروں گا..... قمر دین کی شکایت رفع ہو جائے گی..... اگر کوئی بزدلی کا طعنہ دیتا ہے تو دیتا رہے..... میں کہہ دوں گا کہ نیکی کر رہا ہوں..... میں بزدل نہیں ہوں..... ویسے نیکی اور بزدلی میں فرق کیا رہ گیا ہے"

اُسے امید تھی کہ اب نیند آجائے گی..... لیکن نیند پھر غائب تھی۔

وہ ایک بار پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا..... ٹانگوں میں بری طرح سے الجھی چادر کو کھینچ کر الگ کرنے کی کوشش کی۔

"نیکی کرنا بڑا مشکل کام ہے..... اللہ جانے ہمارے آبا و اجداد کیسے قدم قدم پر نیکیاں لٹاتے پھرتے تھے!"

اُس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

"صبح ہاتھ منہ تو اندر ہی دھوؤں گا..... شام کو کام سے لوٹ کر قمر دین کے گھر کے سامنے جمع پانی کیچڑ اکٹھا کر کے بالٹی میں بھر کر بڑی سڑک پر ڈال آؤں گا"

اُسے حیرانی ہوئی کہ فیصلہ ہوتے ہی نیند چپکے چپکے اُسے سہلانے لگی اور وہ سو گیا۔

اُس کی بیوی اس کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر اُسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"اٹھو..... مل سے دیر ہو جائے گی..... پہلے ہی نوکری خطرے میں پڑی ہے"

صبح ہو چکی تھی لیکن روشنی کم کم تھی۔

"یہ سالا سورج نہ بھی نکلے تو اندر ہی اندر روٹھتا رہتا ہے"

وہ جلدی سے اٹھا۔ ٹپکتے نل نے رات بھر میں بالٹی بھر دی تھی..... اُس نے اٹھائی اور چل پڑا۔

دروازے پر پہنچا تو اُسے رات کا دھیان آگیا..... وہ پلٹ آیا۔

اندر گھڑے کی مینڈھ پر جم کر پہلا چھپاکا مارا تو بیوی کا تیزابی قہقہہ اس کے کانوں کی نالیوں میں سے گزر کر اس کے دماغ کو چھیل گیا۔

دورانِ جنگ اس کی بیوی اسلحے کی سپلائی کا کام پورے خلوص اور تندہی سے سرانجام دیتی تھی۔

اس کے بچے قطار میں کھڑے آنکھوں میں حیرت بھرے اُسے گھور رہے تھے۔

اُس نے ایک ہی چھپاکے پر اکتفا کی اور پلٹ کر بیوی پر برس پڑا۔

"سارے فساد کی جڑ تم ہو..... تمہاری ہوتی سوتی کی وجہ سے زندگی کا عذاب نازل ہوا ہے..... ورنہ آج جنت میں عیش کر رہے ہوتے"

اُس نے روٹی کی پوٹلی جھپٹ لی اور جواب چھوڑتا باہر نکل گیا۔

مِل میں وہ پوری توجہ سے کام کرتا رہا..... اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ اپنے آپ کو بچا کر زیادہ سے زیادہ کپڑا بُن سکے۔ اس میں اس کی اپنی اور اُس کے مالک دونوں کا فائدہ تھا۔

کھانے کے وقفے میں اُس نے یونین کے دفتر سے چھانٹی کی خبر کی سُن گُن لینے کی کوشش کی۔

گینڈے کی مانند پلے یونین والے نے دودھ کی پوری بوتل اندر اتاری اور پھر ایک لمبا بدبودار ڈکار لیا..... اس کے بعد اُس نے نمکین کی تھیلی کا منہ کھولا اور ایک سانس میں چوس گیا۔

یونین والے نے اُسے تسلی دی۔

"تم اپنے آدمی ہو..... تمہارے لیے جان اور نوکری ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے ہیں..... سب ٹھیک کر لیں گے..... بس دعا کرتے رہا کرو"

اُس نے ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھا اور کاؤنٹر کی طرف انگلی اٹھا دی۔

رحیم بخش نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ صرف دعاؤں پر چل رہا تھا..... ہر وقت اُٹھے ہاتھ شل ہو گئے تھے لیکن دعاؤں کی ضرورت ختم ہو کر نہ دیتی تھی..... کبھی اپنے لیے کبھی دوسروں کے لیے.....

اُس نے یونین والے کا ہاتھ چوم لیا..... اُسے ہری جھنڈی دکھا دی گئی تھی۔

وہ لرزتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے بل ادا کر آیا۔

اس کے باوجود اس کے سر پر کے ساتوں آسمان اُٹھ گئے تھے اور وہ اچانک گرم ہوا کی مانند ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ وہ بادلوں پر تیرتا گھر پہنچا۔

حسبِ معمول بجلی غائب تھی..... رات سرِ شام آن پہنچی تھی۔

اُس کی بیوی گلی میں آستین چڑھائے منتظر کھڑی تھی..... وہ اُسے دیکھتے ہی پاگل کتیا کی طرح بھونکنے لگی۔

"میں صبح سے تیرے جانے کے بعد آنکھوں اور نتھنوں کے نشتروں پر رکھی ہوں..... بستی بدل لو اب میں یہاں نہیں رہ سکتی"

تھوڑی دیر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا..... پھر ایک دھماکے سے سب کچھ سمجھ میں آگیا۔

اُس کی نگاہیں بیوی کے کرخت چہرے سے پھسل کر گلی میں گھوم

گئیں۔

نیچا اوپر، دروازوں پر، بر ساتیوں میں، کھڑکیوں کے فریموں میں، چہرے ہی چہرے تھے..... متجسس، حیران چہرے..... اُن میں پھٹی پھٹی آنکھیں اُس پر جمی تھیں۔

اُس کی بیوی مسلسل اپنا آپ پیچھے جا رہی تھی۔

''میرا دوپٹہ لے لے.....اپنا پاجامہ اُتار دے.....''

اُس نے پلٹ کر قمر دین کے گھر کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔

قمر دین معہ اہل و عیال دروازے پر کھڑا تھا۔

اس کے گھر کے سامنے ہر وقت رِس رِس کرتا پتلا کیچڑ جمنے لگا تھا.....سیاہی مائل کائی کی پتلی پتلی تہہ کناروں سے جمانے لگی تھی۔

رحیم بخش تذبذب کے عالم میں کبھی سر کھجاتا، کبھی چیختی بیوی کو دیکھتا.....پھر ایک چور نظر گلی پر ڈالتا اور اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔

''اچھی بھلی کی ہے ابھی تو آدھی ہوئی ہے، پوری کرنے پر کیا ہوگا؟''

ایک لونڈے نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔

''چاچا..... آج لگتا ہے تیرے گھر پانی نہیں آیا.....میں بالٹی بھر لاؤں؟''

اچانک ہر طرف کھُس پھُس ہنسی کی بادسموم چلنے لگی۔

رحیم بخش سر سے پیر تک جلنے لگا..... تھی جہنم کی سی سنالی آگ سے کہیں زیادہ ظالم اور بے رحم تھی۔ وہ چاروں طرف سے شعلوں میں گھرا اندر لپکا.....پانی سے منہ تک بھری تیار بالٹی اُٹھائی اور دوڑتا ہوا باہر دروازے پر آ گیا۔

پھر اُس نے بالٹی سر سے اوپر بلند کی اور پوری قوت سے پانی قمر دین کے گھر کی طرف اُچھال دیا۔

گلی قہقہوں کے طوفان بدتمیزی سے گونج اُٹھی۔

اُس کی بیوی شرم و حیا کو چھوڑ کر سرِ عام اُس سے لپٹ گئی۔

قمر دین اپنے دروازے پر کھڑا چیخا رہا تھا۔

''رحیم بخش.....تو سیدھا جہنم میں جائے گا.....سیدھا.....''

رحیم بخش کی ہنسی چھوٹ گئی.....وہ ہنستا چلا گیا۔

پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں میں لت پت ہو گئیں۔

''قمر دین تو ٹھیک کہتا ہے.....اوپر والی جہنم برداشت کر لوں گا.....نیچے والی نہیں ہو کر رہتی.....''

بخشش

کیدارناتھ شرما

"لالہ۔ ایک سگریٹ اور پلاؤ۔ آج تو تمہاری سگریٹ بہت مزہ دے رہی ہے" میں نے تب تک وہ پہلی سگریٹ ختم نہیں کی تھی جس کو لالہ نے میرے اُس کی دکان کے سامنے بیٹھنے پر پیش کیا تھا۔ لالہ نے حسبِ معمول میرے وہاں بیٹھنے پر میرا خیر مقدم کیا تھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آ کر بڑے خلوص سے مجھے کرسی پر تشریف رکھنے کے لئے کہا تھا اور مجھے ایک بڑھیا قسم کی سگریٹ کی پیش کش کی تھی۔ میں بڑے اطمینان کے ساتھ وہاں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس دن بھی لالہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے پر شادابی اور بشاشت تھی۔ جب میں نے اُس سے دوسری سگریٹ کے لئے فرمائش کی تھی تو میں نے دیکھا کہ لالہ کے چہرے پر رونق نہ رہی تھی۔ اُس نے مجھے دوسری سگریٹ دیتے وقت پہلے جیسی گرمجوشی نہ دکھائی تھی۔

میں اُس علاقے کے تھانے میں ایک کانسٹیبل تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے مجھے جو ڈیوٹی سونپی گئی تھی وہ مقابلتاً آسان تھی۔ اس کام میں کچھ بالائی آمدنی ہو جاتی تھی۔ تجربے سے میں نے جانا تھا کہ لوگ اپنی مرضی سے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔

جن کاغذات پر کوئی تصدیق کرنے کی درکار ہوتی وہ کاغذات مجھے دے دیے جاتے۔ میں جھٹ سے اپنی بائیسکل پر سوار ہوتا اور منزل پر پہنچ جاتا۔ درخواست دہندہ کی سکونت اور چال چلن کی تصدیق کروا کر میں کاغذات تھانے میں لاکرشی کے سپرد کر دیتا۔ اِس کام کی تکمیل میں مجھے کوئی دقت نہ اٹھانی پڑتی۔ لوگ میری خاطر تواضع بھی کرتے اور کچھ نہ کچھ بخشش بھی دے دیتے۔ یہ رقم ہر معاملہ میں الگ الگ ہوتی اور رضاکارانہ طور پر دی جاتی۔ ایسے لوگوں کی سہولت کے لئے میں اُس علاقے کی ووٹر لسٹ کی ایک نقل اپنے پاس رکھتا تاکہ تصدیق کرتے وقت دقت نہ ہو۔ لوگ اس سے خوش ہو کر بخشش بھی اچھی دیتے۔

میری کارکردگی سے میرے افسران خوش تھے اور علاقے کے لوگ بھی۔ تھانے کے منشی نے نوکری کے اُمیدواروں کے چال چلن کی تصدیق کے کاغذات بھی میرے پاس بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ اس کام کے لئے بھی لگ بھگ اُسی جیسی کارروائی ہی درکار تھی جس کا مجھے کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ نوکری سے متعلق ہونے کی وجہ سے اِس کام میں مجھے بخشش بھی اچھی ملنے لگی تھی۔

اِس قصبے میں میرا رسوخ بڑھنے لگا تھا۔ حالانکہ میں بہت کم پولیس وردی میں ہوتا تھا پھر بھی اُس علاقے کے باشندے مجھے سادہ کپڑوں میں بھی پہچان لیتے تھے اور میری عزت کرتے تھے۔ وہ لالہ مجھے پہچاننے لگا تھا اور وہ مجھے حوالدار صاحب کہہ کر ادب سے مخاطب ہوتا تھا۔ بیڑی سگریٹ کی ایک ادنیٰ سی دکان چلانے والا لالہ ایک کمزور دل آدمی تھا۔ وہ مجھ سے میل ملاپ بڑھائے رکھنے میں ہی اپنی مصلحت سمجھتا تھا۔ شاید وہ دل ہی دل میں یہ سوچتا تھا کہ اوپر اُس کی جان پہچان کا کوئی تو ہے۔ چاہے جو کچھ بھی وہ سوچتا ہو وہ لالہ مجھے ہر بار ایک قیمتی سگریٹ کی پیش کش ضرور کرتا جب بھی وہ مجھے دکان کے آگے سے گزرتے دیکھتا۔ "حوالدار صاحب آج ہمارے سے ایک سگریٹ نہ پیو گے؟ شاید جلدی میں ہو" میں وہاں رُک جاتا اور سامنے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا۔ وہ لالہ مجھے ایک قیمتی سگریٹ پیش کرتا۔ مجھے پیش کش تو چائے کے لئے بھی ہوتی لیکن چائے کے لئے میں کبھی راضی نہ ہوتا۔ چائے کی مجھے عام طور پر ضرورت ہی نہ ہوتی تھی کیونکہ جس گھر میں کسی تصدیق کے کام کے سلسلے میں میں جاتا وہاں مجھے چائے تو پینی ہی پڑتی۔

شروع شروع میں جب لالہ مجھے سگریٹ پیش کرتا تو میں اُس کے دام چکانے کے لئے کہتا تھا لیکن لالہ کا یہ جواب سن کر کہ "یہ دکان آپ کی تو ہے صاحب" میں چپ رہ جاتا اور ہاتھ ہٹا لیتا۔ پھر تو لالہ سے سگریٹ مفت میں لے کر پینا اپنا حق سمجھنے لگا تھا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم کے مصداق پر جب بھی میں اُدھر سے گزرتا لالہ سے سگریٹ وصول کئے نہ جاتا۔

میں لالہ کی دی ہوئی پہلی سگریٹ پی رہا تھا پھر بھی میں نے لالہ سے دوسری سگریٹ کی مانگ کر ڈالی تھی اور لالہ کے ہاتھ سے لے کر اپنے ہاتھ میں رکھ لی تھی۔ تبھی میری توجہ سامنے کی گلی سے خراماں خراماں چلی آ رہی ایک دوشیزہ کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اُس کی چال میں بلا کی مستی تھی۔ اُس کا لباس سادہ تھا۔ سفید پوشاک میں وہ پری چہرہ اتنی حسین لگ رہی تھی گویا کہ عرش سے اُتری کوئی حور ہو۔ وہ سفید فام نازنین اُس طرف ہی بڑھتی چلی آ رہی تھی جہاں میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے لمبے گیسو اُس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ اُس حسینہ کا خوبصورت چہرہ پورنیما کی سی دمک رہا تھا اور ہر تماشائی کو اپنا گرویدہ بنا رہا تھا۔ اُس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں شباب کی حیا صاف ظاہر تھی۔ وہ اپنی جھکی جھکی نظروں کے ساتھ لالہ کے روبرو آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں اُس کے حسن و جمال کی کشش محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر پیوست ہو گئی تھیں۔ شاید اس وجہ سے اُس کے رخساروں پر سُرخی ظاہر ہو اُٹھی تھی۔

"آدھا کلو دودھ" اُس نے بڑی شائستگی سے لالہ سے کہا۔ اُس کی مترنم آواز پورے ماحول میں رس گھولنے لگی۔

"پیسے؟" لالہ نے کرخت لہجے میں کہا۔ وہ شاید اُس ترنم سے بے خبر تھا جس سے میں مسحور ہونے لگا تھا۔

"میرے پِتا جی بیمار ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے تو فوراً آپ کے

چچا آپ کو مل جائیں گے۔"

"وہ کب سے تو بیمار پڑا ہے۔ میں کب تک دیکھتا رہوں گا۔"

"ہمارے گھر میں ایک بھی پیسہ نہیں ہے۔ یہ دودھ بیمار آدمی کو دینا ہے۔"

"ایسا کب تک چلے گا۔ پہلے ہی تو اُدھار کی رقم چڑھا ہے۔"

"ٹھیک ہوتے ہی ہم آپ کے پیسے چکا دیں گے۔"

"آپ کے گھر کا اور خرچہ بھی تو چلتا ہوگا؟ اُس کے لئے پیسے کہاں سے آتے ہیں؟"

وہ چپ ہو گئی۔ شاید گھر کے لئے سودا سلف خریدنے کے لئے بھی اُن کے پاس پیسے نہ تھے۔ بنیا نے بھی شاید انہیں اُدھار دینا بند کر دیا تھا۔ اُس بھولی بھالی معصوم لڑکی کے چہرے پر اُداسی چھا گئی تھی۔ وہ بے بسی کے عالم میں لالہ کی تیکھی و درشت بدکلامی کو بڑی عاجزی سے سن رہی تھی۔

"لالہ۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ میری نوکری لگنے والی ہے۔ ایک سرکاری پکی نوکری کے لئے میرا چناؤ ہو گیا ہے۔ پولیس والے میرے کاغذات کی تصدیق کی تکمیل کر کے لے گئے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں میرے آرڈر مل جائیں گے۔ میں پہلی تنخواہ ملتے ہی تمہارا حساب چکا دوں گی۔"

"تیری نوکری۔ واہ!"

"ہاں ہاں..... میری نوکری۔ یہ سچ ہے" میں نے اُس معصوم چہرے پر اُمید کی کرن دیکھی جس سے اُس کا چہرہ ایک بار پھر شگفتہ اور شاداب ہو گیا۔ لالہ نے اُس کی بات کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ اُس کی نوکری کی بات پر اُسے یقین نہیں آیا۔ وہ اپنی بات پر اٹل تھا۔ اُس نے شاید اُسے دودھ نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"کل میں نے تمہارے ہاتھ میں کئی نوٹ دیکھے تھے جو تم نے مٹھی میں بھینچ رکھے تھے۔ تم اُس وقت بازار میں آگے بڑھ گئی تھیں یہ دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ کچھ نقد لیا ہوتو تم آگے بازار سے خریداری ہو اور اُدھار کیا ہو تو میرے پاس....."

"ہاں۔ لالہ۔ اِدھر اُدھر سے سب پیسے جو گھر میں مل پائے تھے میں انہیں جوڑ کر چاچی کی دوا لینے گئی تھی۔"

"چاہے کچھ بھی ہو۔ اب دودھ اُدھار میں نہیں مل سکتا۔ پہلے پچھلے دام چکاؤ۔ پھر آگے کی بات کرو۔"

لگتا تھا کہ وہ لالہ جی کا آخری فیصلہ تھا۔ اُس نے اپنے آگے رکھے دودھ کے برتن کو خالی لوٹا دیا۔ میرے دل و دماغ پر جو حسن کی جلوہ گری تھی وہ اچانک ہی کافور ہو گئی۔ پھر میرے دل میں اُس معصوم لڑکی کے لئے انسانی ہمدردی اور مروت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ میرے اندر انسانی درد کا ایک دریا موجزن تھا۔ اُس کملائے ہوئے پھول سے چہرے پر چھائی گہری اُداسی نے میرے اندر کے جذبے کو خوب جھنجھوڑ دیا۔ اُس کی بے بسی پر میں اندر ہی اندر پگھلا جا رہا تھا۔ اُس کی یاس میں ڈوبی پُرنم آنکھیں رنج و غم کی ایک کربناک داستاں بیاں کر رہی تھیں۔ اُس نے پھر ہمت کر کے اپنا دودھ کا برتن لالہ کے آگے رکھ دیا اور اپنی مانگ دہرائی۔

"لالہ۔ آج آج تم دودھ دے دو۔ کل کے دودھ کے پیسے میں کہیں نہ کہیں سے لے کر آؤں گی۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں۔ وہ میرا آخری فیصلہ ہے" لالہ نے برتن کو ٹھوکر مار کر اپنے آگے سے ہٹا دیا۔ وہ لڑھک کر نیچے جا گرا۔

اُس نے بے چارگی میں لالہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظریں ایک بار پل بھر کے لئے میری طرف بھی ہوئیں۔ مجھے لگا کہ انسانیت کے نام پر مجھے بھی اپنا رول نبھانا چاہئے۔ اُس کی نظروں نے میرے ذہن میں یہ سوال بڑی شدت سے اُٹھا دیا تھا۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ مجھے فرض کی ادائیگی کے لئے للکارنے لگا۔

لالہ میرا مہربان تھا۔ وہ میری عزت کرتا تھا۔ جب کبھی میں اُس کی دکان کے آگے سے نکلتا تھا وہ میرا میری عزت افزائی کرتا تھا۔ میں اِس تذبذب میں تھا کہ اِن حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ لالہ کی حمایت یا لڑکی کی طرفداری۔ کافی دیر تک میں اِس کشمکش میں مبتلا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

مجھے یہ خیال آنے لگا تھا کہ کل میں اِس گلی میں ایک نوکری کے معاملے میں چال چلن کی تصدیق کرنے کے لئے گیا تھا جس لڑکی سے متعلق کاغذات لے کر میں اُس گھر میں داخل ہوا تھا تو وہاں میرا اُس لڑکی سے سامنا نہ ہوا تھا۔ ایک رحم دل مخلص خاتون نے میری پُرشفقت خاطر تواضع کی تھی۔ وہ بزرگ خاتون پڑوس سے دو معتبر اشخاص کو بلا لائی تھی۔ اُن کے بیان قلمبند کر کے میں نے کارروائی مکمل کر لی تھی۔ لوٹتے وقت ایک نحیف سی آواز نے خاتون سے کہا تھا۔ "اِس لڑکے کو پچاس روپے دے دو جو میرے کوٹ کی جیب میں رکھے ہیں۔" میں بیچ میں ہی بول پڑا تھا۔ "اتنی اچھی نوکری اور تنخواہ صرف پچاس روپے" نہ جانے یہ الفاظ کیوں میرے منہ سے اچانک نکل گئے تھے۔ اِس سے پہلے میں نے کبھی بھی بخشیش نہ مانگی تھی۔ میں وہاں سے چل پڑا تھا۔ تبھی مجھے وہ آواز سنائی پڑی تھی۔ "ٹھہرو بیٹے۔" ایک پُرشفقت مگر نحیف آواز دوسرے کمرے میں آئی تھی۔ کچھ نقل و حرکت کے بعد ایک ضعیف العمر بزرگ ایک لاٹھی کے سہارے سے آ کر میرے روبرو کھڑا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ عرصے سے بیمار تھا اور لاغر ہو گیا تھا۔

"میرے پاس آؤ" اُس نے پکارا "یہ لو۔ یہ پچاس تو ہو گئے ہی۔"

اُس نے کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اُس بزرگ نے وہ رقم نہ جانے کہاں کہاں

سے تلاش کر کے کاشی کی تھی۔

"تم شراب تو نہیں پیتے ہو۔ خیر۔ ان سے بچوں کے لئے مٹھائی لے جانا۔ اچھا جیتے رہو بیٹے۔ خوش رہو۔" اور وہ لوٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں وہ رقم جو اس نے مجھے ادا کردی تھی لینا نہ چاہتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس گھر میں کُل یہی سرمایہ تھا اور باقی کچھ نہ تھا۔ اس پر بھی میں اس رقم کو نہ لوٹا سکا جبکہ میں اُسے دل سے لینے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی مایوس ہو کر دودھ کا برتن ہاتھ میں لئے ہوئے لوٹ گئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بات پختہ ہو گئی تھی کہ وہی لڑکی ہے جس کے کاغذات کی تصدیق کرنے کے لئے میں اس کے گھر گیا تھا اور جس کے بیمار والد نے انتہائی مجبوری میں مجھے پیشکش دی تھی۔ تب سے میرا ضمیر میری لعنت ملامت کر رہا تھا۔ میرا پیشکش مانگنا سراسر ایک زیادتی تھی۔ بیمار اور مفلس ہونے پر بھی اس نے میری مانگ کو..... میری ناجائز مانگ کو پورا کیا تھا۔ وہ عمر رسیدہ ایک تجربہ کار آدمی تھا اور اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ کچھ پولیس والے عام طور پر ایسے حالات میں معاملہ اس قدر بگاڑ دیتے ہیں کہ اُسے سلجھانا انتہائی محال ہو جاتا ہے۔

ندامت کے احساس نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ میں نے آخر کار دل ہی دل میں فیصلہ کر ڈالا۔

"لالہ جی۔ لڑکی کو دودھ دے دو۔" میں نے گرج کر کہا۔ لالہ سہم گیا۔ وہ یہ سُن کر سکتے میں آ گیا۔ لڑکی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اظہار تشکر تھا۔ لڑکی مڑ کر پھر لالہ کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ لالہ نے آگے بڑھ کر برتن لڑکی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے اس میں دودھ ڈال دیا اور اُسے لوٹاتے ہوئے اس نے لڑکی سے کہا۔ "اچھا۔ لے جاؤ۔ میرا حساب جلدی چکتا کر دینا" اس کے لہجے میں ایک تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔

"یہ لو سو روپے اس کھاتے میں جمع کر لو۔ دیکھو آگے کے لئے جب بھی یہ لڑکی دودھ لینے کے لئے آئے تو اُسے دودھ کے لئے انکار نہ کرنا۔"

لڑکی نے ایک بار پھر میری طرف پُر احترام نگاہوں سے دیکھا۔ وہ چلی جا رہی تھی اور اس گلی میں اسی گھر میں داخل ہو رہی تھی جس گھر میں بزرگ نے پُر شفقت طریقے سے مجھ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ پیشکش تو وہ ہوتی ہے جو خوشی کے موقع پر یا کام ہو جانے کی خوشی میں رضاکارانہ طور پر دی جاتی ہے۔

میرے ہاتھ میں جو سگریٹ تھی جسے میں بڑے مزے سے پی رہا تھا ختم ہو گئی تھی اور جو دوسری سگریٹ میں نے لالہ سے مانگ کر لی تھی اُسے میں نے لالہ کو لوٹا دیا تھا' کالاب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ بات اب پوری طرح سے میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ پیشکش کیا ہوتی ہے۔

سرور انبالوی

کوئی رہنما' کوئی ہمسفر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا
نہ ہو جس کو خوف نہ کچھ خطر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

جو خلوص و مہر کا ہو امیں' کہ جو درد سے بھی ہو آشنا
کہیں اس طرح کا کوئی بشر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

دلِ زار لے گیا مجھے در یار پہ' کبھی دار پہ
وہ ہوس پاک جس کے دل و نظر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

مرا سایہ ساتھ رہا مرے' میں نگر نگر پھرا عمر بھر
جسے کہہ سکیں کبھی معتبر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

مرا راہبر مرا عزم تھا' سر منزل آ تو گئے مگر
کہیں راستے میں کوئی شجر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

وہ جو پیڑ ہم نے اُگایا تھا بڑی آرزو بڑے شوق سے
یہ المیہ ہے کہ کوئی ثمر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

رہ زندگی کے ہر ایک موڑ پہ غم گسار ملے بہت
پہ جو درد دل سے ہو باخبر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

مرے ذہن و دل میں بسا رہا جو خدا کی طرح سے عمر بھر
کسی مرحلہ پہ سکوں مگر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

چلو بے عمل تھا سرورؔ تو' تھا خطیب شہر تو پارسا
پھرے جس کو ڈھونڈتے عمر بھر نہ اُسے ملا نہ مجھے ملا

O

کونپلیں

انور خواجہ

بات کچھ بھی نہ تھی۔

مگر سارے فارم میں پنجے بھرے جوش و خروش کی طوفانی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ بس بات صرف اتنی تھی کہ پانچ سو کلرکوں، انجینئروں اور ماہر سائنسدانوں کی مملکت میں حوا کی تین بیٹیوں نے قدم رکھ دیا تھا اور آدم کے جذبات کو پھر سے ترغیب دی تھی۔

سب کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ چھٹی کا الارم اپنی وحشت خیز آواز میں چیخ رہا تھا۔ دفتروں سے باہر لوگ اور تجربہ گاہوں سے سائنسدان اپنے بیگ اٹھائے بسوں کی طرف لپک رہے تھے کہ اچانک ٹرانسپورٹ کے دفتر سے تین لڑکیاں کالے کالے برقعوں میں لپٹی ہوئی باہر آ گئیں۔ ان کے آگے ٹرانسپورٹ کے محکمے کا کلرک مونچھوں والا فورمین تھا۔ جو لوگ بسوں میں چڑھ رہے تھے وہ رک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے حیران و ششدر ان نازک بدن پریوں کو دیکھنے لگے اور جو بسوں میں بیٹھ چکے تھے انہوں نے کھڑکیوں سے گردنیں نکال کر ان کو نگاہوں کا نشانہ بنا لیا۔

وہ تینوں اس کے دن تھے نرم نرم ہلکی ہوا چل رہی تھی اور ان کے برقعے جھلملا رہے تھے اور ریشمی نقابوں سے ان کے چہروں کا نور چھن چھن کر باہر آ رہا تھا۔ وہ بس نمبر ۴ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ فورمین نے بس میں چڑھ کر سب کو مخاطب کیا۔ "میرے بھائیو! ہر ایک کے گھر میں ماں بہنیں ہوتی ہیں۔ آج اس بس میں بھی تین بہنیں سفر کر رہی ہیں۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ جوش سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے، رنگ فق ہو گیا اور ہونٹ کپکپانے لگے۔

بس میں سکوت مرگ طاری ہو گیا۔

ٹپ ٹپ ٹپ۔ بس کے لکڑی کے فرش پر ایڑیاں بجیں اور وہ تینوں دروازے کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئیں جو ان کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ سب نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ کھڑکی سے ہوا کے جھونکے سے ان کے ریشمی نقاب ادھر ادھر ہلے اور ان کے سفید سفید نرم گال، کانوں میں نئے فیشن کے لمبے آویزے اور سرمگیں آنکھیں صاف نظر آنے لگیں۔ بہت سوں کی تو آنکھیں ہی چندھیا گئیں۔

بس میں خلاف معمول خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ان لڑکیوں سے دو نشستیں چھوڑ کے پیچھے تقریباً سب چپڑاسی لوگ براجمان تھے جو بس روانہ ہوتے وقت سیٹیاں بجاتے، نعرے مارتے، مرغ اور گیدڑ کی آوازیں نکالتے مگر آج وہ بھی خاموش تھے۔ بس چپ چاپ فارم اور کالونی کی حدود سے نکل کر سیدھی سڑک پر ہولی۔ کھڑکیوں سے اندر آتی ہوئی ہوا میں رفتہ رفتہ عطر کی بھینی بھینی خوشبو بھی گھل رہی تھی۔

لوگ بس سے گردنیں نکالے سڑک کے اس پار امریکن ماہروں کی خوبصورت کوٹھیوں کے باہر لمبی لمبی چمکتی رنگین کاروں اور لانڈریوں میں ملبوس نیم عریاں امریکن عورتوں کو دیکھ رہے تھے جو تالاب کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کی چوڑی چکلی گلابی رانیں سادگی اور کندنی آفتاب کی شعاعوں میں خوشنمائیاں رقص کر رہی تھیں۔

دوسرے دن فارم کے ہر ایک کو ان تین ٹیلی فون آپریٹروں کے نام اور پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ بھرتی کے دفتر کے کلرک دوسروں کو ان لڑکیوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچا کر بڑے خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔ ان کے زرد مریل چہروں پر احساس برتری چمکتا تھا اور ٹرانسپورٹ کے دفتر میں خاصی گہما گہمی تھی۔ ٹرانسپورٹ کے دفتر والوں کو اب اپنی اہمیت اور "خود نمائی" کا احساس ہوا تھا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ بس نمبر ۴ میں ان کا پاس تبدیل کر دیا جائے۔ جب بس ٹیلی فون ایکسچینج کے پاس ان کو سوار کرنے کے لیے رکی تو دوسری بسوں والے نہایت حسرت سے اس متبرک بس کو دیکھنے لگے۔

دوسرے دن جب وہ بس میں سوار ہوئیں تو ان کے ساتھ ایک مونچھوں والا اور ایک داڑھی مونچھ چٹ چوڑا چکلا گنجا انٹ کے سر والا فوجیوں کی طرح تھیلا لٹکائے بوڑھا بھی تھا۔

ان کے بس میں سوار ہوتے ہی کانا پھوسی اور کھسر پھسر شروع ہو گئی پھر ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کو معلوم ہو گیا۔ گنجے سر والا ٹیلی فون سپروائزر ہے اور دوسرا ہیڈ آپریٹر اور دونوں آپس میں چچا زاد ہیں۔

ایک ان لڑکیوں کی پچھلی اور ایک ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور فکر کو انہوں نے محفوظ کر لیا۔ اس دن کے بعد بابوؤں کی بے لگام نگاہیں جب بھی ان نشستوں کی طرف بھٹک جاتیں تو گنجے سر والے سپروائزر کی خشمناک آنکھوں سے ضرور چار ہوتیں اور شرمندگی اور انتقام کا احساس لیے واپس پلٹ آتیں۔

اس دن جب وہ دونوں ٹاؤن صدر میں اتر گئے تو بس والوں نے اطمینان سے شرنک ان لڑکیوں کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور سرگوشیوں میں اپنی آرا سے ایک دوسرے کو مطلع کیا۔

آج ان لڑکیوں کو فارم میں ملازم ہوئے ڈیڑھ دو مہینے ہو گئے تھے۔ صبح کی ہوا کافی خنک ہو چلی تھی۔ اور دھوپ کی شعاعوں کی تپش بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔

فارم شہر سے پندرہ میل دور تھا۔ فارم کے ملازمین کو صبح سرکاری بسیں لے جاتیں اور شام کو واپس چھوڑ جاتیں۔ بسیں شہر کی آخری آبادی تک پوری روانہ ہوتیں اور صدر سے ہو کر فارم کا رخ کرتیں۔

نسیم اور رشید نمبر ۴ بس کے باہر کھڑے سکول اور کالج جاتی ہوئی

لڑکیوں کے تانگوں کو گھور رہے تھے۔ نسیم کی عمر بمشکل بیس سال کے لگ بھگ تھی وہ موٹی موٹی آنکھوں والا گندمی رنگ کا جاذب نظر چلبلا سا کھلنڈرا اور شریر لڑکا تھا وہ سفید پتلون قمیض اور نیلے سویٹر میں ملبوس خاصا سمارٹ لگ رہا تھا۔ رشید کی عمر نسیم سے دو تین سال ہی زیادہ تھی لیکن چہرے مہرے اور اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی ذکاوت سے وہ سنجیدہ اور بڑی عمر کا معلوم ہوتا تھا اس کا رنگ سفید تھا وہ چیڑ کے درختوں کی طرح اونچا لمبا حسین جوان تھا اس کی عادات و اطوار سے تہذیب اور تجربہ کاری مترشح تھی مگر اس ساری سنجیدگی کے پندار کے باوجود جب وہ اپنے قریب کسی لڑکی کو محسوس کرتا تو اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی اور چہرہ تمتما اٹھتا۔

قریباً آٹھ بجے ساری بسیں آگے پیچھے روانہ ہوئیں وومن کالج کے پاس پہنچ کر نسیم اور رشید نے بس کی کھڑکی سے گردنیں باہر نکال دیں اور تانگوں سے اترتی لڑکیوں کو گھورنے لگے لڑکیاں بھی آدھے چہرے اور آدھے جسم چھپائے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیدار عام کی دعوت دے رہی تھیں۔ لوہاری دروازے کے پاس پہنچ کر ان کی بس رکی ایک ٹیلی فون آپریٹر سوار ہوئی یہ بے چاری مرنج اور مسکین طبیعت کی لڑکی تھی اور اس کی آواز بڑی کھردری تھی۔

آگے چل کر بس بڑے بازار کے چوک میں رک گئی اور لوگ سوار ہوئے اب بس آدمی بھر چکی تھی۔

"ارے او نسیم کے بچے وہ دیکھ آئی آئی" پہلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک کلرک نے جوش سے چیختے ہوئے پکارا۔

تقریباً تمام لوگوں نے کھڑکی سے گردنیں باہر نکال لیں کہ آخر کیا آفت آگئی ہے۔ سامنے کی سڑک کے پاس وومن کالج کی بس گھڑگھڑاتی ہوئی آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ ہوا سے اڑتے ہوئے گستاخ پردوں میں سے حسین دلاویز دلکش اور جانسوز چہرے جھانک رہے تھے کالی کالی۔ نیلی نیلی۔ بھوری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نسیم اور رشید کی سیٹ کے بالکل سامنے ایک لال لال سے چہرے سرخ ہونٹوں نیلی آنکھوں والی پٹھان لڑکی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے جوانی کا رس پھوٹ کر باہر آرہا تھا نسیم نے جھٹ اسے ایک عدد سلام جڑ مارا اس نے شرما کر جلدی سے چہرہ موڑ لیا۔ دوسری لڑکیوں نے مسکراتے ہوئے چمکیلے دانتوں میں دوپٹے دبائے کھڑکیوں میں آویزاں پردوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔ بس میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور بس چل پڑی۔

"ارے کم بخت ادھر دیکھ" نسیم نے رشید کو ٹہوکا مارا۔ رشید نے ان لڑکیوں پر سامنے کے آئینے سے اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر کہا۔

"میں کیا دیکھوں کم بخت میری تو آنکھیں ہی چندھیا گئی ہیں اللہ قسم کیا لڑکی ہے۔ بخدا سانچے میں ڈھلا جسم ہے اور اس کی وہ سرخ قمیض اور وہ مرمریں گردن جی چاہتا ہے آدمی ہونٹ رکھ کر سو جائے اور نیلی آنکھوں کا تو مت پوچھ جی چاہتا ہے ان کی نیلاہٹ میں ڈوب ڈوب جاؤں مگر ہائے رے قسمت ہم تو کنوارے ہی مریں گے"

"اور سنا ہے کہ کنواروں کا جنازہ بھی نہیں ہوتا" سامنے کی سیٹ سے نثار نے جواب دیا۔

"دیکھ کم بخت ادھر چھوڑ اس قصے کو" نسیم نے پھر رشید کو ٹہوکا مارا۔

سڑک پر خاصی بھیڑ تھی بس آہستہ آہستہ اس تانگے کے پیچھے جا رہی تھی دونوں برقعے والی لڑکیوں کے درمیان بیٹھی لڑکی دوپٹہ منہ میں دبائے نظریں جھکائے ہنس رہی تھی نسیم نے شاید اسے سلام مارا تھا دونوں برقعے والی لڑکیاں اسے اپنے درمیان بھینچے ہوئے تھیں برقعوں میں خاصی ہل چل تھی۔ بے پردہ لڑکی کے سینے کا تلاطم اتنی دور سے بھی صاف نظر آرہا تھا اور اس کے سانولے سلونے رنگ میں لال لال سے داغ ابھر آئے تھے اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ بس میں بیٹھے ہوئے تمام آدمیوں کی نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت اور اشارے پر مرکوز تھیں۔ اس کے جسم کے حساس حصوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔

چند لمحوں بعد راستہ صاف ہوگیا اور بس آگے نکل گئی نسیم نے گردن نکال کر ہاتھ ہلایا چیریو چیریو۔

لڑکیوں کے بڑے سکول کے دروازے کے سامنے تانگوں کے ہجوم نے پھر راستہ روک لیا سکول کا بڑا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ دروازے میں سے رنگ رنگ اور طرح طرح کے کپڑے پہنے خوب صورت نازک اندام الھڑ چلبلی اور گداز جسم والی لڑکیاں اپنی رسیلی آنکھوں سے باہر کی دنیا کو دیکھ رہی تھیں جو ان کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جو لڑکیاں تانگوں میں سے اتر رہی تھیں وہ بھی نیم پردہ کیے ہوئے تھیں تانگے سے اترتے ہوئے کسی کا برقعہ اٹھ جاتا تو برقعے میں سے اس کی مرمریں گردن۔ گال اور سینے کے تھرتھراتے چاند نظر آتے کسی کی ٹانگ تانگے میں سے اترتے رک جاتی تو اس کی شلوار اوپر چڑھ جاتی۔ اور گوری گوری چکنی پنڈلیاں دل موہ لیتیں اور کوئی سارے بند توڑ کر اپنے جسم کے سڈول خطوط کی نمائش کرتی۔ بے حجابانہ اور گستاخ نظروں سے بس کی طرف دیکھتی۔

"نعرہ تکبیر"

"اللہ اکبر"

بس کی آخری سیٹوں سے چھوٹو سوڈو کو بھی اتنی ڈھیر ساری لڑکیاں دیکھ کر جوش آگیا تھا۔

بس اڑی چلی جا رہی تھی سول لائن کے پاس پولیس چوکی کے قریب باقی دو ٹیلی فون آپریٹر بھی کھڑی تھیں۔ دونوں کے جسم لیڈی ہملٹن کے کالے برقعوں میں لپٹے ہوئے بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے ان میں چھریرے بدن کی کم عمر لڑکی کا نام زبیدہ تھا اور دوسری کا جسم بھرا بھرا اور قدرے بھاری تھا اس کا نام زاہدہ تھا۔

سب بس والوں کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں آگے زبیدہ اور پیچھے زاہدہ۔ ہلکے پھلکے باریک نقاب میں سے اس کے چہرے کے نقوش نظر آرہے تھے اور اس کے لال لال شہد آگیں ہونٹ تو جیسے دعوت دے رہے تھے۔ زاہدہ نے

گھٹنوں سے نیچے تک لٹکی ہوئی سرخ شوخ کڑی لکیروں والی قمیص پہن رکھی تھی اور کالی پینٹ کا کولہے پر قدرے لٹکا ہوا تھا۔ برقعے کی صرف اوپر کی ایک طنابیں بندھی تھی۔ باقی کھلا تھا۔ اس طناب سے نیچے ایک گھونگھٹ سی تھی اور اس کی مدور چھاتیاں پیٹ کا خم اور کولہوں کی دلکش گولائی کی توبہ شکن جھلکیاں نظر آتی تھیں یہ جلوے صرف ایک لمحے میں سب کو مسحور کر دیتے تھے۔

بس پھر چل پڑی۔

ان لڑکیوں کے سانس کی تپش اور کپڑوں کی سرسراہٹ نے نسیم کو بے چین کر رکھا تھا۔ عطر کی تیکھی تیکھی مست کن خوشبو بھی فضا میں پھیل رہی تھی۔

نسیم نے ناک اونچی کر کے "شوں شوں" کی آواز نکال کر سونگھنا شروع کیا "ہائے کیا مدہوش کن خوشبو ہے جیسے زنانہ زعفران کی خوشبو ہے"

رشید نے اس کی ران میں چٹکی لی۔ "ذرا شرافت سے بیٹھو"

نسیم سیٹ پر اچھل پڑا اور پیچھے سے ایک دھیمی سریلی آواز آئی جیسے ستار کے تاروں پر کوئی بے ترتیب ہاتھ پڑ جائے اور وہ احتجاج میں چیخ اٹھیں۔

"کمینے"

"سن لیا خطاب برخوردار" رشید نے بزرگوں کے سے انداز میں سر پر ہاتھ پھیرا "ہائے ظالم کیا آواز تھی جیسے کوئی گنگناتا آبشار گرے اور ٹھہر جائے"

صدر کے اڈے پر دونوں حسب معمول بس میں سوار ہو گئے۔ بوڑھے بھاری بھرکم پہرہ دار نے سرخ سرخ آنکھوں سے تمام بس کا جائزہ لیا اور بے باک نظروں کو اپنی خوفناک آنکھوں سے زیر و زبر کیا مگر وہ جو سامنے کی اونچی سیٹ پر چپڑاسی بیٹھا ہوا تھا اس نے پہرہ دار کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ وہ بڑے اطمینان سے گھٹیا فلمی ایکٹروں کے انداز میں سگریٹ پی کر فضا میں دھوئیں کے مرغولے بنا رہا تھا اور آنکھوں کے کونوں کو سکیڑ کر بے ہنگم باندھے ان لڑکیوں کو گھور رہا تھا۔ سارے لوگ اس کی بے حیائی اور بدتمیزی کو بری طرح محسوس کر رہے تھے۔

آخر رشید سے برداشت نہ ہو سکا اس کی وہ رگ جو سکول اور کالج کی فضا میں کافی تہذیب اور تعلیم حاصل کر چکی تھی پھڑک اٹھی۔

"تمہارے پاس بس پاس ہے"

"ہاں کیوں نہیں" اس نے درشت لہجے اور خونی آنکھوں سے جواب دیا۔

"تمہاری کون سی سیٹ ہے"

"یہی جس میں بیٹھا ہوا ہوں۔"

اب سیٹ کا مالک بھی آ گیا ہے

"بھائی جان آپ اپنی سیٹ پر چلے جائیں" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"یہ میری ہی سیٹ ہے" اس نے چنگھاڑ سے جواب کا چانٹا مارا۔

سارے لوگ اس کا خون پی جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

رشید زخمی سانپ کی طرح غصے میں پھنکارا۔ بس سے اتر کر ڈرائیور سیٹ کے نکڑ کے اونچے لمبے پہرہ دار کو بلا لیا جس نے اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے چپڑاسی کو کھا جانے کی کوشش کی۔

"گوشٹ گوشٹ" وہ اپنی بھاری کرخت آواز میں چیخا ساری بس گونج اٹھی۔

"میرے پاس اس بس کا پاس ہے" اس کا رنگ فق تھا غصے اور خیالات کے جذبات اس کے کالے بھدے چہرے میں مجسم ہو کر صاف نظر آ رہے تھے اس کی صورت مسخ ہو گئی تھی اور رحم کی بھیک مانگتی ہوئی نظر آتی تھی۔

"گوشٹ"

نیلی آنکھوں والے پہرہ دار نے اس کا کمزور ہاتھ اپنی آہنی گرفت میں لے لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا سامنے کھڑی فارم کی مرغی ڈھونے والی بس میں لے گیا جو جنگلی بس کے نام سے مشہور تھی جس میں سیٹوں کے بجائے تختے رکھے ہوئے تھے۔ فارم میں اس سے باربرداری کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

اس ہیرو کے یوں بے آبرو ہو کر نکلتے ہی چپڑاسیوں نے سیٹیاں بجائیں اور فقرے مارے۔ دوسرے تیسرے دن ایسے ہیروں کو خوار و بے عزت کر کے بس سے نکالا جاتا۔

"ایسے غنڈوں پر تو توپ دم کر کے مر کر دینی چاہیے" بس کی آخری نشستوں سے کسی کلرک کی زخمی غیرت چیخ اٹھی۔

"سالے کی ساری بدمعاشی نکل گئی" رشید نے کہا۔

"ہیرو کا بچہ سمجھتا ہے کہ یوں وہ ان لڑکیوں کو پھانس لے گا" اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک کلرک نے گردن موڑ کر رشید سے دھیمی آواز میں کہا اور اسی بہانے ان لڑکیوں پر بھی ایک نظر ڈال دی۔ بس صدر سے روانہ ہو گئی۔

رشید نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کلرک کو مخاطب کیا۔

"ان بدمعاشوں نے ان بے چاریوں کو رنڈیاں ہی سمجھ لیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی بھونڈی حرکتوں اور ہتھکنڈوں سے ان کو پھانس لیں گے بھائی تیری قدرت اگر وہ رنڈیاں ہوں بھی۔ تب بھی سارے فارم کا دل خوش نہیں کر سکتیں۔"

ڈیزل بس کا شور کافی تھا مگر ان لڑکیوں نے رشید کے الفاظ سن لیے۔ سرسراہٹ سی ہوئی ایک کوئل سی آواز آئی۔

"کمینے ذلیل میرے اوپر بکواس کرے۔"

نسیم نے ایک زور کا قہقہہ مارا ایک چنگھاڑ چانٹا ہاتھ بھی رشید کی رانوں پر مارا وہ کھلا اٹھا اور تفریح منانے کے لیے خود بھی چٹخارا کا لے کالے برقعوں کے قلموں میں پھر سے اس کا دامن ہو گیا۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی بس آگے بڑھنے لگی۔

بس اب آبادی سے نکل کر سرسبز و شاداب کھیتوں کے بیچوں بیچ سیدھی سڑک پر معتدل رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ دور افق کے اس پہاڑی چوٹی پر توانا تنومند جیالا دیوتا سنہری رتھ میں سوار اپنے جسم سے روشنی کی پھلجھڑیاں کرتا بڑھا آ رہا تھا۔ بادل رقیق ہو کر پارہ پارہ ہو گئے تھے پر ننھا سا بادل ایک ریشمی جھالر کی طرح سورج کے گرد لٹک رہا تھا۔ چلچلاتی دھوپ کا سایہ کھیتوں پر سے پھسل رہی تھی اور نسیم کی طبیعت ڈول رہی تھی۔

وہ ڈرائیور کے سامنے آویزاں آئینے سے ان لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا کے شریر جھونکے ان ریشمی نقابوں میں زیر و بم پیدا کرتے کبھی تیز جھونکے سے نقاب بالکل ایک طرف ہو جاتے اور وہ حسین چہرے صاف نظر آتے پھر کوئی لمبی لمبی انگلیوں والا مخروطی ہاتھ اوپر اٹھتا سنبھل سنبھل کر بڑھتا اور نہایت آرام سے نقاب اپنی جگہ واپس آ جاتے۔ ناخنوں پر پالش کی چمک اور ہونٹوں پر سرخی کی دمک نسیم کی دنیا میں ہل چل مچا دیتی اور اس کے دل میں پھندے سے لگ جاتے اور وہ اپنے جوش و خروش کا سارا اظہار رشید پر کرتا۔ اس کی کمر میں کھجلیاں ملتا۔ رانوں میں چٹکیاں لیتا اور تیلیر کی طرح مسلسل بولے جاتا اس کے فقرے بس کی فضا میں نیلے پیلے سرخ سبز رنگ بکھیر دیتے۔

"بس زہرہ کے ہونٹ دیکھ کر مجھے میکس فیکٹر یا ریولان کی لپ اسٹک کا اشتہار یاد آتا ہے۔ اور اس پر آفر جو نظر کے لب ریلے خوں نشاں زندہ زندہ ہونٹ اور ان کے نازک ملائم گداز حساس پھڑ پھڑاتے ہوئے کنارے اور مسکراہٹ میں ان کی خیدگی اُسپردگی کی فضا بس مار دیا ظالم۔"

وہ رشید کو گدگداتا آخر وہ اس کی کمر میں ایک تول کر دھموکا رسید کرتا تو وہ چند منٹوں کے لیے خاموش ہو جاتا۔

بس اب دریائے سوات سے نکلی ہوئی نہر کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ نہر کے کنارے خانہ بدوش پاوندے خیمہ زن تھے۔ جو سردیوں کے موسم میں خیبر کے راستے افغانستان سے پاکستان آ جاتے ہیں۔ نہر کے کنارے ایک دوشیزہ برتن دھو رہی تھی۔ اس نے ایک لمبا سا کھلا کلی دار فراک پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ قندھاری انار کی طرح لال سرخ تھا اور شباب کے رس میں رچا ہوا دہک رہا تھا۔ کالی کالی زلفیں ناگوں کی طرح چہرے کے گرد لہرا رہی تھیں۔

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس لڑکی کو خرید لوں" رشید نے کہا۔

"کیا اس کی قیمت ہزاروں روپے ہو گی" نسیم نے جواب دیا۔

بس آگے بڑھ گئی۔

"اس ملک میں آج بھی عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح بکتی ہیں" رشید کے اندر بیٹھا ہوا ایک زمانے کا ترقی پسند بول اٹھا۔

"جب تک اس ملک میں یہ نظام ہے اس وقت تک بڑے بڑے اہل ثروت عورتوں کو خریدتے اور فروخت کرتے رہیں گے اور ہم جیسے لوگ گھٹ گھٹ کر سسک سسک کر مرتے رہیں گے"

"جب تک اس ملک میں پردہ ہے تب تک ہم ترقی نہیں کر سکتے" نسیم نے تائید کی اور کنکھیوں سے ان برقعوں پر نظر ڈالی اور زیر لب مسکرایا بھی۔

"پردے کا حکم تو اسلام نے دیا ہے" اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے ایک کلرک نے کہا۔

اب بحث مذہب اور کفر کے درمیان الجھ گئی آخر داڑھی کے ذکر پر ایک ملا داڑھی پر بگڑ گئے اور انہوں نے تمام داڑھی مونڈنے والوں کو کافر قرار دیا۔ اس پر بس میں قہقہوں کے فوارے چھوٹ گئے۔ فوارے ابل پڑے برقعوں میں ریشم کے انبار ہلے سے خوشبو کی لپٹیں اٹھیں لباس کی سرسراہٹ بلند ہوئی۔

بس پوری رفتار سے منزل کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی۔

رشید نے آئینے میں ان لڑکیوں پر نظر ڈالی زہرہ کی گوری گوری کلائیاں برقعے سے باہر سانپ کی طرح کنڈلی مارے جھولی میں پڑی تھیں اس نے اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اس کے جسم میں ایک آتش سیال مچل رہی تھی کوئی غیر مرئی حدت سرایت کر رہی تھی اور اس کے تصور کے ذہنوں پر کوئی سبک سبک قدم رکھتا ذہن کے دروازے کھول کر اندر چلا آ رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا زہرہ کی آواز میں انوکھی نرمی ہے ایک انمول کوملتا ہے سپردگی اور نسوانی لانبیت ہے اس میں گیتوں کی مستی۔ سندرتا اور لوچ ہے اس میں جوانی کی جھنکار ہے۔ پیار کی مٹھاس ہے۔

اگر چاندنی راتوں کے سکوت میں جب کہ جسم و جاں میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ انگڑائیاں لے رہی ہو

کسی کی قربت سے اٹھتی ہوئی آنچ اور خوشبو مدہوش کیے ہو اور اس آواز میں کوئی پیار محبت کی باتیں کرے تو انسان اس لذت اس کیف کو ابدی بنانے کے لیے آب حیات پینے کے بجائے خودکشی کر لے تو یہ لذت یہ کیف ازلی ہو جائے۔

اس نے پہلی دفعہ یہ آواز سنی تھی تو بھونچکا رہ گیا تھا۔ یہ تو اس کی آئیڈیل محبوبہ کی آواز تھی ایک رس اور شیرینی کا دھارا کانوں کے راستے روح میں پگھل گیا حلول کر گیا۔

لیڈیز ٹیلیفون اپریٹروں کو بھرتی ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا مگر اس دوران میں اسے شہر کا کوئی نمبر نہیں ملا ہمیشہ ایک ہی جواب آیا۔

"شہر کی لائنیں انگیج ہیں"

"کیا ساری لائنیں انگیج ہیں" آخر اس نے تنگ آ کر پوچھا۔

"جی ہاں ساری" اور پھر ایک لڑکھڑاتا ڈگمگاتا ہوا بدمست چھوٹا سا قہقہہ اس کے کان میں آ گرا جیسے منہ میں اچانک رس گھل آ جائے اس نے حیران ہو کر ریسیور رکھ دیا مگر اس لذت کا احساس اس کے دماغ میں بس گیا رچ گیا۔

جب سے یہ لڑکیاں ٹیلیفون ایکسچینج میں آئی تھیں شہر کا کوئی نمبر خوش قسمتی ہی سے ملتا تھا۔ افسروں سے کلرک اور چپڑاسیوں تک سب کو ٹیلیفون بیٹ

سے عشق ہوگیا تھا۔ ہر ایک امریکی لڑکوں سے دو دو باتیں کر کے دل کا بخار اتارنا
چاہتا تھا اور بعض فحش مذاق اور سخت کلامی کر کے اپنے جذبات کو تسکین دینے کی
کوشش بھی کرتے۔ اسی لیے شروع کے دنوں میں ٹیلی فون پر وہ نرگس کی طرف سے
کلرکوں اور چپراسیوں کے خلاف کئی شکایتیں فارم کے جنرل منیجر کے پاس پہنچ گئی
تھیں جس پر خوب خوب ڈانٹ پڑی تھی۔ حالات کچھ دنوں میں معمول پر آگئے مگر
منہ کی چاٹ تو سب کو پڑ چکی تھی جو چھڑائے نہ چھٹتی تھی اور کئی منچلے بابو انگریزی
فلموں کے انداز میں رسیور پر بوسے بھی اڑاتے تھے۔

ایک دن رشید اس فارم اور اس شہر کی گھٹن فضا اور بے رنگ زندگی
سے اداس اور بیزار دفتر میں بیٹھا اس لمحے کو کوس رہا تھا جب اس نے یہاں نوکری
اختیار کی تھی کہ چپڑاسی ٹیلی فون اٹھا کر اس کی میز پر رکھ گیا اس کا افسر دوپہر کا کھانا
کھانے چلا گیا تھا۔

اس نے یونہی وقت کاٹنے کے لیے رسیور اٹھایا۔

"کہیے فرمائیے" ایک مترنم آواز آئی۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا یہ تو وہی آواز تھی جو راتوں کی
خاموشی میں آوارہ کتوں کی طرح اس کے ذہن میں گونجتی تھی کیسی مانوس کتنی جانی
پہچانی اور کتنی دوستانہ مربیانہ آواز تھی۔

"کیا شہر کی لائنیں خالی ہیں" اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے
ہوئے کہا۔

"جی ہاں کون سا نمبر چاہیے"

"کوئی سا ملا دیجئے"

"نہیں نمبر ہے ۲۱۲۸۲۱ ملا دیجئے"

"لیجیے"

گھنٹی بجنے لگی اس نے رسیور رکھ دیا اس "لیجیے" میں کتنی ہمدردی تھی ایسا
تھی کہ مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لو اور سے وجود کو اپنے وجود میں ضم کر دو۔ کتنی دلکشی
تھی۔ رشید سوچنے لگا۔ شاید اس کے ٹوٹے سہارے کی ڈور سے جڑ سکے یا آواز اس
کے لیے ایک نیا سہارا بن سکے۔ افسوس سہارے کتنے کچے کتنے بودے ہوتے
ہیں۔

اس لق و دق شہر میں اس جذبات کش ماحول میں صرف ایک نخلستان
تھا۔ جعفر ادا کی ذات سے وابستہ تھا جس نے ایک فوجی افسر سے شادی کر لی تھی۔
اب اس نے پھر صحرا نوردی شروع کر دی تھی مگر دور دور تک کسی کی زلف کا کوئی
سایہ نہیں تھا کوئی پیار کا نخلستان نہیں تھا۔ یوں تو جسم بہت تھے اس شہر کی بے شمار
گلیوں میں تاریک مکانوں میں جسموں کے انبار تھے مگر روح نہیں ملتی تھی۔
روح یا تو اس شہر میں سے ہجرت کر گئی تھی یا اسے ہوٹلوں میں بند کی گئی تھی کہ اس کی
گرد و غبار آلود ان کے گھروں تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔

ایک دو مہینے کی کوشش کے بعد وہ تھک گیا تھا۔ بات "لیجیے" اور
"دیجیے" سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بیکلیس و پنگلور پر بیٹھ کر راگ سنانے کے
خواب دیکھ رہی تھیں اب اس نے ٹیلی فون کو ہاتھ لگانا بھی چھوڑ دیا تھا اور مایوس
ناآسودہ اور مردہ دل ہو کر وہ اپنے آدرشوں اور آئیڈیلوں کے بت توڑ بیٹھا تھا۔
اس نے فن اور ادب کے بلند چبوتروں سے اتر کر عام بابو لوگوں میں اپنے آپ کو
شامل کر لیا تھا۔ اور ان کی ذہنی سطح پر اتر آیا تھا۔ انہی کی طرح بس میں فحش اور پھکڑ
مذاق کرتا اور بے تحاشہ قہقہے مارتا۔

جس دن وہ مریلی آواز اس کے حوصلے بڑھا دیتی تو پھر سے اس کے
دل میں امیدوں کے چراغ جھلملانے لگتے اور وہ بس میں کافی مہذب قسم کی
باتیں کرتا۔

بس اب فارم کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف
امریکن ماہروں اور افسروں کی کوٹھیوں کے باہر امریکی کاریں کھڑی دھوپ میں
چمک رہی تھیں۔ اور انگیا اور چھوٹی نکر میں ملبوس نیم برہنہ امریکی عورتیں دھوپ سینک
رہی تھیں ان کے مضبوط کسرتی جسم چمک رہے تھے۔ متورم علاقوں اور نمایاں
شانوں پر نظر پھسل رہی تھیں۔ بس کے تمام سواروں کے جسموں سے آنکھوں کو
نور اور دل کو سرور بخش رہے تھے۔

"بخدا یہ اتنے محنتی لوگ ہیں" ایس ڈی او صاحب نے اپنے ساتھی
سے کہا۔

"شک کیوں نہیں صاحب" ساتھی نے جواب دیا "کل تک یہاں
خاک اڑتی تھی اور دور سے کی ہولناک ہواؤں میں ریگ غائب ہو جاتی تھی۔ مگر اب تو
سبزہ ہی سبزہ ہے یہ سب ان کی برکت ہے"

بس اب ٹیلی فون ایکسچینج کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ یہاں سے تھوڑی
دور پر دفاتر واقع تھے۔ ان لڑکیوں نے برقعے سنبھال لیے۔ ساری بس کی نظریں
ان پر جمی ہوئی تھیں۔ مونچھوں والا ہیڈ ماسٹر اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کی سیٹ پر
جھک گیا۔ حتیٰ کہ اس کی چھاتی ان کے شانوں سے ٹکرانے لگی اور ان تینوں نے
جلدی جلدی گٹھڑی بکس اٹھائے اور گلو خلاصی کرائی۔ ساری بس والے اس منظر کو
دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ مونچھوں والا بوڑھا ٹھرک جھاڑ رہا
ہے۔

وہ دونوں بوڑھے جب ان لڑکیوں کو اپنے حلقے میں لے کر روانہ
ہوئے تو ایک چپڑاسی اٹھ کر ان کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا اور سیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"خوب گرم ہے"

اس پر شور بلند ہوا۔

پیچھے سے ایک اور لمبا سا چپڑاسی اٹھ کر آیا اس نے پہلے چپڑاسی کو
ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ پھر بڑے پیار سے جیسے وہ واقعی ان لڑکیوں کے جسموں کو
سہلا رہا ہو سیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اس سیٹ پر لیٹ گیا اور ایک چیخ ماری۔
ساری بس میں نعرے سیٹیاں اور قہقہے گونجنے لگیں۔

ناحق ہم پہ تہمت.... ڈاکٹر عمران مشتاق

"پروفیسر مورسن آپ پر الزام ہے کہ آپ نے اپنی پوزیشن اور اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اپنے مریضوں سے نامناسب تعلقات قائم کرنے پہ اصرار کیا اور ان کی مجبوری و بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی۔"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "میں تو چیونٹیاں بلوں سے باہر نکل آئی ہیں" گردن میں پیدا ہوتی سختی نے منہ پھیر دیا۔

"آپ کے یوں سر ہلانے کو الزامات کی صحت سے انکار گردانا جائے یا....."

"آج اس بات پہ یقین آگیا کہ بے وقوفوں کے سروں پہ سینگ نہیں ہوتے ورنہ سلام پھیرنے کا انکار یا اقرار سے کیا تعلق....."

"آپ کا اب تک کا رویہ عدالت کو جلد فیصلہ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے جس کا نتیجہ آپ کے حق میں یقینا..... "آنکھوں کی جھنجھناہٹ نے گردن موڑنے پہ اکسایا۔ "شاید میرے مرنے کے وقت نہیں ورنہ فیصلوں کا ذکر کرتے ہوئے زبان کی لرزش اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ دیکھنے کے لائق ہوتی۔"

"آپ نے تو اپنے سر جھکا خیال کیا اور نہ ہی عمر کی پختگی ہوتی اجازت ورزیدگی کا لحاظ خاطر میں لائے۔ آپ کا عمل پروفیشنل کنڈکٹ کے سراسر منافی رہا ہے حتیٰ کہ اپنی انا و خواہشات کی تکمیل کے لئے بے بس مریضوں کو بلیک میل تک کیا جاتا رہا ہے..."

فضا میں جھینگروں کی آواز ہی شور بن گئی تھی اور سفید دیواروں پہ چند سیاہ دھبے سے نمودار ہونے لگے تھے۔ دل کے معاملے میں سب جائز ہے پیار محبت عشق ان شعبوں کا عمر سے کیا علاقہ۔ طاقتور کمزور کو قدموں میں جھکاتا ہی آیا ہے صدیوں سے زمانے کی یہی ریت ہے اور دستور کو بدلنا کوئی اچھا عمل تو نہیں۔ بات جب محبت کی آجائے تو معمولی سا دباؤ طاقت کا استعمال تھوڑا ہی ہے۔"

"مریض کو ڈاکٹر پہ اعتماد ہوتا ہے بالکل مسیحائی معجزے کی طرح ہے ڈاکٹر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ شفا کی طرف پہلا قدم ہوتے ہیں۔ قدم ہوا سے چلتے منزل پہ جا کے ہی رکتے ہیں اور معجزہ ہو جاتا ہے آپ کی شخصیت ایسے معجزوں کے لئے مشہور رہی ہے۔ اگر آپ تیز تیز رستے پہ قدموں کو چھوڑ دیں تو منزل دو ہاتھ کی دوری پہ ہی روشنی بن جاتی ہے جو نظر کی حد میں ہوتے ہوئے بھی دسترس سے دور رہتی ہے آپ نے کئی مریضوں کے ساتھ یہ کھیل کھیلا وہ اس امید پہ آپ کے سنگ رہے کہ صحت کے بند تالے کی کنجی آپ کی جیب میں ہے۔ بند تالوں کو آپ نے کھولا تو مگر اپنی حیوانی خواہشات کی تکمیل کے لئے....."

کھمبیوں اور جھینگروں کی جسامت میں اضافہ ہو اٹھا۔ سیاہ دھند آنکھوں میں موجود سفیدی پہ چھا رہی تھی۔ "مرد اور عورت کے تعلق کو نامناسب نام دینے والے تو فیصلوں پہ قادر نہیں ہو سکتے۔ محبت اور رغبت کی باہمی کشش کو عفریت بنا آسان عمل تو نہیں۔ دوستوں سے عبارت اس تعلق میں جہاں جذبوں کی دلکشی مدھم پڑ جاتی ہو وہیں احساس کی کتاب زندگی ہے آدمی کی بربادی و تباہی کے نشاں تو چھوڑتی ہی ہے ورنہ اس کے وجود کی حقیقت فسانہ ہی ہے۔"

"ناپاک خواہشات کا کھیل کبھی کئی سال تک کھیلا گیا تو کبھی اسے تین سال تک دہرایا گیا۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ سب کچھ ایسے ہی ہوا اور مریضوں کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہ تھی۔"

اپنی بلند قامت کے سامنے اسے کئی بونے نظر آئے۔ کچھ تو انگلی بھر رہے ہوں گے۔ ایک ذرا سی کوشش سے اس کی انگلیاں چھت کو چھو لیتیں۔ "چٹکی بھر بونے اور پہاڑ پھلانگ ڈالنے چلے ہیں۔ کتنی ہی بڑی چھلانگ لگائیں میرے دامن کی گرد تک پہنچ نہیں سکتے مٹھی کی جان اور اتنی ہمت ایسے تو چلے....."

"ڈاکٹر مورسن کا کیس ڈاکٹر ریچرڈسن سے مختلف نہیں۔ ریچرڈسن اپنے کئے کی سزا پا چکا ہے اور اب کبھی بھی پریکٹس کر کے عوام کی جان و صحت کے لئے خطرہ نہیں بن سکتا البتہ ڈاکٹر مورسن کا معاملہ....."

"ڈاکٹر ریچرڈسن تو کب کا مڈل ایسٹ جا چکا اور حق اپنے کئے پہ بہت خوش ہیں کہ انصاف ہو گیا۔ وہ وہاں لاکھوں کے حساب سے پاؤنڈ سمیٹ رہا ہے جو یہاں کبھی بھی پا نہ سکتا۔ میرے معاملے کو ڈاکٹر ریچرڈ سے ملانے کی کوشش انتہائی بد دیانتی اور کمینگی ہے اس کا مجھ سے کیا مقابلہ۔ اس نے تو اس کریہہ صورت بڑھیا سے تعلقات استوار کئے تھے جو کہ اس کے کیریئر میں آخری کیل ثابت ہوئے تھے۔ اتنے گندے ذوق کا شخص اور میرے مقابل..... تف ہے....." حقارت سے پھینکی ہوئی تھوک یقینا کسی بونے کے چہرے تک پہنچی تھی اس نے رومال کی اک جھلک سی دیکھی جو فوراً ہی غائب ہو گئی۔ بونے اب زیادہ جوش و خروش سے اچھل رہے تھے اور ہاتھوں کو آنے لگے تھے اس نے اپنی آنکھیں فوراً میچ لیں۔

"ڈاکٹر ریچرڈ کا کیس....."

"یہ کیا ڈاکٹر ریچرڈ..... ڈاکٹر ریچرڈ لگا رکھا ہے" خشونت نے چہرے سے رنگ بدلا "ایک دھتکاری ہوئی منحوس بڑھیا جو اس کی مریضہ بھی تھی پہ عاشق ہوا اور اسی بڑھیا کا جنرل میڈیکل کونسل کو شکایت کر کے اس کے لائسنس کو منسوخ کروا دیا۔ اب اس کی لاش گلتی اور پھر بھی کمبخت اب مڈل ایسٹ میں عیش کرتے ہوئے بے وقوف عربوں کو الو بنا کر مزے اڑا رہا ہے"

"پروفیسر مورسن آپ کے علم میں یہ بات یقینا ہوگی کہ ہم ہر ڈاکٹر سے گڈ میڈیکل پریکٹس کے خواہاں ہیں اس کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ مریضوں کے ساتھ صرف پیشہ وارانہ تعلق ہی رکھا جائے تا کہ انہیں ہسپتال سے باہر ریسٹورنٹس ہوٹلز اور پبلک مقامات پہ ملاقات کے لئے مدعو کیا جائے جیسا کہ آپ کے عمل سے ثابت ہے اور آپ کو اس پہ کوئی افسوس یا تاسف بھی نہیں....."

"عقل سلیم ہر انسان کے ذاتی حق کو تسلیم کرتی ہے میرا کسی بھی

انسان کا ذاتی معاملہ ہے کہ کسی سے تعلقات رکھے جائیں یا نہیں۔ سرکاری اداروں، قوموں، ملکوں کو اس سلسلے میں نہ جانے کیوں ناحق تکلیف ہوتی ہے۔ پھر وہ کبھی قانون کے نام پر تو کبھی عوام کے جان و مال، صحت کو جواز بنا کر اپنے فیصلوں کی تلوار لے کر آمر پہ مسلط ہوتے ہیں۔ کسی آشنا سے ہوٹل میں ملاقات کی جائے، پبلک گارڈن میں ملا جائے یا ویک اینڈ کے لئے کسی پر سکون جگہ جا کے کچھ وقت اطمینان و مسرت سے بتایا جائے، اس میں قانون کو تشویش کیوں ہوتا ہے، سرکاری اداروں کی پریشانی سمجھ میں آنے والی چیز ہے.....“

”اس کیس کا سب سے اہم اک پہلو یہ ہے کہ ایک مریض کو یا قاعدہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے آپ کے ساتھ ناجائز تعلقات نہ رکھے تو آپ سے مینٹل ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں بند کر دیا جائے گا یعنی لائف پیشنٹ اس کا مقدر بنا دیا جائے گا۔“

درشتی، بے حسی، خشونت، سختی، لاتعلقی لئے ہوئے وہ چہرے لگتے تو انسانوں کی طرح ہی تھے مگر کیا وہ انسان تھے۔ اس کا ذہن الجھ گیا۔ الجھن تو اس بات کی تھی کہ جس مریض کا ذکر کیا جا رہا تھا اس کی جانب سے کوئی شکایت موصول نہ ہوئی تھی۔

”یہ ہمارا فرض ہے کہ عوام کی صحت و جان کی بھرپور حفاظت کریں اور ایسے تمام ڈاکٹرز کا احتساب کیا جائے جو مطلوبہ معیار پہ پورے نہیں اترتے اور بدقسمتی سے آپ بھی ان ڈاکٹروں میں شامل ہیں۔“

”کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ ڈاکٹر بے چارے کا کوئی حق نہیں۔ اس سے ہر سال سینکڑوں پونڈ اس مد میں وصول کئے جاتے ہیں کہ اُسے سال بھر پریکٹس کرنے کا لائسنس حاصل رہے۔ ہمارے پیشوں پہ لگنے والا دعویٰ عوام کی کتنا ہے اور ڈاکٹر کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور اس کی بقیہ زندگی کا فیصلہ کرنے والوں میں ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ لے مین (Layman) یعنی عوام کے نمائندے بھی شامل ہیں جنہیں طب کی اے بی سی بھی نہیں معلوم۔“

بے تاثر چہروں پہ خوشنا کی جنم لے رہی تھی۔ پہلی بار اس کے من میں خوف نے انگڑائی لی اور دل میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔

”آپ نے کمیٹی کے ساتھ تعاون نہ کر کے اپنے لئے کچھ اچھا نہیں کیا۔ میں کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے مجبوراً یہ فیصلہ کر رہا ہوں کہ آپ کا پریکٹس لائسنس ۳ سال کے لئے منسوخ کر دیا جائے۔ آپ کو کچھ کہنا ہے؟“

اس نے نظریں اٹھائیں تو ان میں اک ڈری ڈری سہمی سہمی سی کیفیت کا پہلا تھا۔ جو دنیاں شاید بلوں کا رخ کر چکی تھیں۔ کھیں اور بنگلوں کی مدد سے کھلی کھڑکیوں نے کی ہوگی۔ بونے گلیور لینڈ لوٹ چکے تھے۔ انسانوں سے کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ وہ سسک پڑی۔ پروفیسر ولس مورین آنسوؤں کو امنڈنے سے نہ روک سکی۔ اس سے پریکٹس کا حق چھین لیا گیا تھا۔ اب وہ خون اگلتی خوفناک نگاہوں اور نوکیلے پنجوں والے لدیوؤں کی سرزمین میں تنہا اور بے بس آ گئی تھی۔

لیاقت علی عاصم

شجر پہ رنگِ مثالی دکھائی دینے لگا
تو پھر شجر ہی خیالی دکھائی دینے لگا

عجب ستارہ سا چمکا تھا اس کی آنکھوں میں
پھر آسماں مجھے خالی دکھائی دینے لگا

ابھی خیال ہی گذرا تھا اس کو چھونے کا
وہ جسم جسم مثالی دکھائی دینے لگا

میں اس کے پہلو سے اٹھا تھا وہ خوشی لے کر
کہ سارا شہر سوالی دکھائی دینے لگا

چھلک رہا تھا وہ کتنا مری محبت میں
بڑھایا ہاتھ تو خالی دکھائی دینے لگا

O

عطاءالرحمن قاضی

بدر کو دیکھو ہلال امکان ہے
جو بھی ہے یکسر زوال امکان ہے

ریت کے نیلے بگولوں کا وہ رقص
دشتِ دل اب بھی غزال امکان ہے

بڑھ گئی ہے بے قراری اور بھی
زخم جب سے اندمال امکان ہے

آئنے میں کھل اٹھی تمثالِ ناز
ہجر بھی کیا کیا وصال امکان ہے

کھو گئے ہیں کن جھمیلوں میں عطاؔ
خود سے ملنا بھی محال امکان ہے

دوسرا رنگ

عابدہ تقی

ایک دودھیا سفیدی تھی جو حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔

وہ پتھروں کو کھودتے کھودتے ایک کونے میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور اسی سفید موت کو سوچ رہا تھا جس نے اس کے باپ کو اور یہاں کام کرنے والے جانے کتنوں کو آ دبوچا تھا۔ تب سے اس کے منظر بھی یک رنگ ہو گئے تھے۔ یہاں تو آسمان بھی نیلا نہیں سفید ہی نظر آتا تھا، سورج اسے سفید مرغی کا انڈہ دکھائی دیتا تھا اور رات کسی ڈراؤنی چڑیل کے سفید دانت۔ جب وہ شہر جاتا اور لاری کے شیشے سے باہر کے مناظر، قطار اندر قطار سبز درختوں اور رنگ برنگ پھولوں کی کیاریوں اور لہلہاتی فصلوں کو دیکھتا تو خوشی کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی لیکن دوسرے ہی لمحے سفیدی لپک کر آتی تھی اور ہر شے کو ڈھانپ لیتی یوں جیسے وہ برف پوش راستوں سے گزر رہا تھا۔

اس عید پر وہ جو اپنی گھر والی کے لئے لال رنگ کا سوٹ لایا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ اسے پھر کبھی "دوشی" نئی نظر آئے لیکن جب وہ عید کی نماز پڑھ کر آیا تو لال جوڑے میں شرماتی لجاتی رجواں ذرا دیر کو دلہن لگی تھی۔ اس نے دوبارہ پلکیں جھپکیں تو اس کے چہرے کی سفیدی کے عکس نے لال جوڑے کو سفید ماتمی لباس میں تبدیل کر دیا تھا۔ رجواں اجڑی ہوئی بیوہ کی طرح لگ رہی تھی یا پھر کوئی اداس روح۔ وہ بیوی کی تعریف میں دو جملے بھی نہیں کہہ سکا، نہ ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھا سکا۔ بس اندر جا کر آنکھوں پر بازو رکھ کر سو گیا۔ یہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ دل دہلا دینے والی بات یہ تھی کہ اس کا بیٹا عالم اور بیٹی زرینہ اپنی ماں کے گھر سے پنجرے میں بند ایک طوطا اٹھا لائے جو شروع میں اسے بھی بہت اچھا لگا۔ اس سفیدی بھرے ماحول میں اس کے سبز پروں کو دیکھنا اسے بھلا معلوم ہوتا تھا اور اس کی ٹائیں ٹائیں بھی اس کے گھر کی گھٹی گھٹی فضا کے بوجھل پن کو کم کرتی تھی لیکن ایک دن عجیب ہوا جب اس کی بیٹی زرینہ نے اسے آواز دی "ابا میرے طوطے کو چوری کھلاؤ میرے ساتھ" اور وہ جیسے ہی پنجرے کے پاس گیا وہ طوطا سفید عفریت بن گیا۔ اس کی ٹائیں ٹائیں اسے سفید موت کا پیغام لگ رہی تھی۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھول کر طوطا اڑا دیا تو زرینہ جو سب کچھ نہیں جانتی تھی جو اس کے باپ پر گزر رہی تھی کئی دن تک روتی رہی تھی۔

اس کے باقی ساتھیوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ کیوں نہیں تھا؟ شاید اس پر کسی اوپری چیز کا اثر ہو گیا ہے۔ یہی سوچ کر اس کی بیوی "سائیں زلفوں والی سرکار" سے پانی بھی دم کروا کے لائی تھی اور "پیچ" سے تھوڑی راکھ بھی لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے منظر بدستور سفیدی اوڑھے رہے۔ اپنی تسلی کے لئے وہ ڈاکٹر سے آنکھیں بھی چیک کروا کے آ گیا۔ ایک دن تو اس سفیدی کے آسیب نے اسے یوں گھیرا کہ وہ کھڑے کھڑے بے ہوش ہو گیا۔ بھائی اسے شہر لے آیا بڑے ڈاکٹر کے پاس۔

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کو اس نمک کی کان میں کام کرتے کرتے؟" ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھ رہے تھے

"پندرہ سال جی" یہ جواب بھی اس کے بھائی نے ہی دیا تھا وہ تو ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا سفید گاؤن اس نمک کا تو نہیں بنا جسے وہ کھود کھود کر نکالتا آیا تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ یہ کچھ دوائیں لکھ دی ہیں۔ انہیں ریسٹ چاہئے اچھا ہو گا انہیں کچھ عرصے کے لئے کسی پر فضا مقام پر بھیج دیا جائے۔ ماحول اور فضا بدلے گی تو ٹھیک ہو جائیں گے" ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر تسلی دی۔

انہوں نے نسخہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ سفید کاغذ کو ہاتھ میں تھام کر اسے جھاڑنے لگ گیا جیسے اس کاغذ پر نمک گر گیا ہو اور دوائی کی گولیاں بھی سفید تھیں اس نے نگلنے کے بجائے دور پھینک دیں۔ "یہ تو نمک سے ہی بنی ہوں گی یہ بھی" اس نے پھر غصہ دکھایا تو رجواں [illegible] لے گئی۔ خیر سلطان کو اب خدا کھودا پڑے گا آئے گا تو خیر کا مسئلہ حل ہو گا"۔ رجو بے بے اور خیرو کے بڑے بھائی سے مشورہ کرنے لگ گئی۔

☆☆☆

وہ سب پشتوں سے یہیں آباد تھے اور کان کنی کے پیشے سے وابستہ۔ اسی نمک کے اردگرد گھومتی ہوئی ان کی برسوں پرانی زندگی اور اسی کے گرد آباد رہے اور یہ ان کی شادیاں اور موتیں، خوشیاں اور غم، بچے اور بچیاں سب کچھ یہیں پروان چڑھا تھا۔ اس کا باپ اسے فخریہ بتایا کرتا تھا "ہمارے اجداد میں بڑے لوگ ہیں پتر ہوئے۔ یہ کلائیں اور بازو ہی ہیں جنہوں نے چٹانیں توڑ توڑ کر یہ کان بنائی ہے" بچپن میں وہ کئی بار باپ کے ساتھ سرنگ کے اندر بھی گیا تھا جہاں بارود پھوڑ کر اور تودے گرا کر راستے بنائے جاتے تھے۔ پھر اس کے باپ کی زندگی بھی ایک ایسے ہی دھماکے کی نذر ہو گئی تو کنٹریکٹر صاحب نے ان کے گھر کو معاوضہ ادا کر کے اس کے کام پر بھرتی ہونے کی خوشخبری بھی ماں کے ہاتھ پر دھر دی۔ "مالکوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ افضل دین کی جگہ اس کے بیٹے خیر دین کو کام پر بھرتی کر لیں۔ "کل بھرتی ہے خیر دین کو بھیج دینا شہر سے مالک بھی آئے ہوں گے" کنٹریکٹر صاحب نے مزدوروں کے لیڈر عبدالصمد سے بات کی تھی جو اب اس کی ماں کو یہ خوشخبری سنانے آیا تھا۔

"چنگا بچہ ہو گیا ہو تو کون روک سکتا ہے۔ یہ تو شکر ہے میرے افضل کو اللہ نے پہلا پتر ہی دیا تھا۔ یہ پتر ہی دن تو کام آتے ہیں" اس کی دادی نے آنسو پونچھ کر اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور وہ اس کی پیٹھ تھپکتی رہیں اپنے آنسو گلے میں اتار کر۔

وہ پہلی بار نئی وردی پہن کر کدال اٹھا کر آیا تو اسے اپنے بڑے ہونے کا احساس خوشی دے رہا تھا خاص طور پر پوسیدہ پھول کرتے ہوئے تو اسے ایسی خوشی ہوئی تھی کہ وہ اسے بیان نہیں کر سکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ خود بھی اس سفیدی کا حصہ بن گیا جو اسے اب اچھی نہیں لگتی تھی۔ جب وہ گھوڑی چڑھا تھا تو ہر رنگ اسے الگ شناخت کے ساتھ نظر آتا تھا۔ دلہن کے گھر میں آنے کے بعد بھی زندگی کی رنگینیاں اسے لطف دیتی رہیں۔ پھر زرینہ اور عالم کا بچپنا بھی اسے رنگ اور راحت کے نئے ذائقے سے آشنا کرنے لگے لیکن جوں جوں اس کا بیٹا عالم بڑا ہو رہا تھا تو اسے سفیدی کی پھپھوندی لگ گئی تھی۔ کیا وہ بھی بیٹے کو وراثت میں یہی دے کر جائے گا اس کے ابا کی طرح۔ یہ سفید دامن اور پھر سفید موت نہیں نہیں وہ گھبرا اٹھا میں انہیں دوسرے رنگ دوں گا میں دوں گا۔ جیسے کی یہ سفید دامن نہیں' اس نے گھبرا کر زرینہ اور عالم کی طرف دیکھا جو دادی کے پاس لیٹے کہانی سن رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا دادی؟" عالم کے سوال پر وہ مسکرا دیا۔ کبھی وہ خود بھی باپ سے ایسے ہی سوال پوچھتا تھا۔

"پھر اللہ تمھارا بھلا کرے بچو بادشاہ نے سب سے چھوٹی والی شہزادی کو بلا کر پوچھا شہزادی! میں تمھیں کتنا چنگا لگتا ہوں؟" دادی نے حقے کا کش لیا تو اس کی گڑگڑاہٹ کو قصے نے بچوں کو پھر مشتعل کر دیا۔

"آگے سنائیں ناں دادی" دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"لو جی اس نیک بخت نے کہا بابا جی! آپ مجھے اتنے چنگے لگتے ہیں اتنے چنگے لگتے ہیں جتنا نمک" دادی نے کہانی آگے بڑھائی تو خیر دین کروٹ بدل کر بول پڑا۔

"بے بے جی بس کریں یہ فضول کہانی اور تم بھی کاکا سو جاؤ اب"۔

اونہہ اتنے اچھے لگتے ہیں جتنا نمک۔ دماغ خراب تھا شہزادی کا' وہ بڑبڑایا لیکن بے بے کو ٹوکنا بے معانی رہتا تھا تو وہ اسی طرح سے بولتی رہیں۔

"بس پھر کیا تھا اتنا سنتے ہی بادشاہ کو جلال آ گیا اس نے شہزادی کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا"۔ دادی نے دکھ سے کہا تو خیر دین خوش ہو گیا بہت اچھا کیا بادشاہ نے میں بھی یہی کروں گا اگر کسی نے نمک کو اچھا کہا میرے سامنے تو میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ اس نے کروٹ بدل لی۔

"اللہ بڑا بے نیاز ہے بچو! بادشاہ کے منہ سے نکلے ہوئے تکبر کے لفظوں سے اس کی پکڑ ہو گئی۔ کرنی خدا کی یہ ہوئی کہ اس بادشاہزادی کی شادی ایک دوسری سلطنت کے شہزادے سے ہو گئی اور اس نے ایک دن اپنے شوہر سے کہہ کر اپنے بادشاہ باپ کی دعوت رکھی اور باورچیوں کو حکم دیا کہ سارا کھانا بغیر نمک کے بنایا جائے"۔

"جلدی سنائیں ناں آگے کیا ہوا" زرینہ کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں لیکن کہانی اب دلچسپ موڑ تک پہنچ چکی تھی۔

"بس پھر کیا تھا جب بادشاہ کے سامنے کھانے کا دسترخوان چنا گیا تو وہ جس کھانے کو چکھتا وہ بے سوادا ہوتا۔ بغیر لون کے کیونکہ شہزادی نے لون تو کھانوں میں ڈلوایا ہی نہیں تھا۔ بادشاہ جس کھانے کو کھاتا وہیں چھوڑ دیتا آخر اس سے رہا نہ گیا تو اس نے میزبان شہزادے سے پوچھا کہ ان کے ہاں کھانوں میں نمک کا رواج نہیں ہے کیا جو اسے یوں بے ذائقہ کھانے کھلائے گئے"۔

"پھر کیا ہوا دادی جلدی سنائیں ناں" بچے بیتاب ہو رہے تھے۔

"تو شہزادے نیک بخت نے کہا بادشاہ سلامت مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کو نمک بہت ناپسند ہے" جس پر بادشاہ نے کہا "یا غلط بالکل غلط نمک تو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے بھلا نمک کے بغیر بھی کوئی مزہ ہے زندگی کا۔ بس پھر شہزادی بھی پردے سے باہر آ گئی اور نقاب اٹھا کر بولی "ابا جان مجھے پہچانے میں ہی وہ شہزادی ہوں جسے آپ نے اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ میں نے کہا تھا کہ آپ مجھے اتنے اچھے لگتے ہیں جتنا نمک" تو بادشاہ شرمندہ ہوا اپنی بیٹی سے معافی مانگی بیٹی کو گلے لگایا اور کہا کہ میں مان گیا کہ نمک بہت اچھا ہوتا ہے لو جی کہانی ختم پیسہ ہضم اب سو جاؤ"۔

اور خیر دین نے کہانی ختم ہونے پر سکھ کا سانس لیا۔ پتہ نہیں کس نے یہ کہانیاں ایجاد کی ہیں۔ اگر بادشاہ کو نمک کھودتے کھودتے زندگی گزارنی پڑتی تو میں پوچھتا کتنا اچھا لگتا ہے اسے نمک' یہ بے بے کی کہانیاں بھی ناں اسی نمک سے بھری ہوتی ہیں' کسی دن ان کی کہانی میں وہ گدھا پانی میں گر جاتا ہے جس پر نمک لدا ہوا تھا اور کسی روز سکندر اعظم کے گھوڑے نمک چاٹ کر مرنے سے بچ جاتے ہیں۔ جو اس علاقے میں آئے تھے۔ کسی روز مغل بادشاہ اکبر کو یہ جگہ پریوں کا مسکن دکھائی دی تھی۔ دادی اس زمانے کی کہانیاں بھی سناتی تھیں جب پہلے زمانے میں ہونے نمک کی دیوار کو ہاتھ لگاتے ہی نمک کے بن جاتے تھے یا پھر اس درویش کا قصہ لے بیٹھتی تھیں جس کی برکت سے اس نمک کی دیوار کو چاٹ کر جو دعا مانگی جاتی قبول ہوتی تھی۔ یا پھر جہلم کے اس بادشاہ کی کہانی جو نمک کے سکے بنایا کرتا تھا۔ اونہہ یہ قصے کہانیاں' وہ پیچ و تاب کھاتے کھاتے تھوڑی دیر میں سو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز ایک نئی ٹورسٹ پارٹی آن پہنچی تھی اور یہ تو اب روز مرہ کا ہی نظارہ تھا۔ ان کے ساتھ ٹی وی کیمرے اور اسٹوڈنٹس و ریسرچ آفیسرز کچھ گورے چٹے کھلکھلاتے بچے۔ سب نمک سے بنی سرنگوں میں سے گزر رہے تھے۔ نمک سے بنا ہوا شیش محل، بادشاہی مسجد، مینار پاکستان، نمک سے گرتے ہوئے میٹھے پانی کی جھیل سیف الملوک اور کئی ایسی حیران کن چیزیں دیکھ کر سب خوش ہو رہے تھے۔ اب وہ سب چل کر اسمبلی ہال میں داخل ہو چکے تھے جہاں انجینئر صاحبان انہیں اس علاقے کی ترقی کے منصوبے ویڈیو اور پروجیکٹر سے دکھا رہے تھے اور پروجیکٹر کے ساتھ ساتھ ان کی آواز کمرے میں گونج رہی

تھی۔

"۵۰۰ء قبل مسیح میں سکندرِ اعظم اس علاقے میں فوج کے ساتھ پہنچا وہ ہسٹری بتاتی ہے کہ یہ اس جگہ کی پہلی دریافت تھی۔ لیکن تاریخی قرائن سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس سے بھی قبل یہ علاقہ جینی بادشاہوں کے زیرِ تسلط تھا۔ ٹورسٹ اپنے نوٹس لیتے جا رہے تھے۔ ہائیک کا رُخ بھی ہسٹری بتانے والے کی طرف تھا۔

"سن 1872ء میں ایک انگریز انجینئر نے اس جگہ کو باقاعدہ دریافت کیا اور یہاں کان کنی کی انڈسٹری کی بنیاد رکھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس سرنگ سے راستہ نکال کر اسے مین روڈ کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی کان کنی کے ماڈرن طریقے بھی متعارف کرائے گئے اور پاکستان نمک انڈسٹری میں نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ بہت بڑا ایکسپورٹر بھی ہے اور اس خوردنی نمک کی مانگ دنیا میں بڑھتی جا رہی ہے"۔ ہسٹری مین نے اپنا لیکچر ختم کیا تو خیر دین نے سوچا۔

نجانے کس بات پر خوش ہوتے ہیں۔ ہم مزدوروں کے لئے تو یہ سب مزدوری ہے یا پھر موت کی سوداگری۔ کتنے ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں بلاسٹنگ کے دوران اور کتنے ہی سالٹ ہیوٹ کٹنگ کے دوران زخمی بھی ہو جاتے ہیں۔ اچانک تودا گر جانے سے دب کر مر جاتے ہیں۔ نمک میں سانس لے لے کر دمے کے دائمی مریض ہو جاتے ہیں لیکن ان ٹورسٹ کو کوئی بتا دے تو نہیں دکھائے گا۔ نہیں کیا پتہ یہ سمجھتے ہیں کہ انجینئر نے کیا کیا بنا لیا ہے یہ تھوڑا ہی دیکھا ہے کوئی کہ مزدوروں نے کیا کیا کھو دیا ہے۔ اسے پھر باپ کی نعش زندہ لاش نظر آنے لگ گئی۔ لیکن اسے انٹرویو میں یہ سب نہیں کہنا تھا۔ جو اسے کہنا تھا وہ اسے یاد کروا دیا گیا تھا وہ کیمرے کے سامنے کہہ رہا تھا۔

"بہت ہی اچھا لگتا ہے یہاں کام کرنا میں ساتویں نسل ہوں یہاں کام کرنے والوں کی۔ یہ ہمارا آبائی پیشہ ہے ہم نسلوں سے یہ کام کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں صحت کی سہولت بہت اچھی ہے آب و ہوا بھی اچھی ہے لوگ شہر سے اور دور دور سے آتے ہیں تو بڑی خوشی ہوتی ہے اور ہمارا تو روزگار یہاں ہی"۔ اس نے کہانی ختم کی تو رپورٹر نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"تو ناظرین دیکھا آپ نے قدرت کا یہ انتہائی طلسماتی عجوبہ جسے انسانی ہاتھوں نے کس مہارت کے ساتھ بنایا ہے اور اسے ایک نئی پاکستان میں تبدیل کر دیا ہے کیمرہ مین قیصر کے ساتھ میں ہوں آپ کی رپورٹر..." وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکا تھا۔ دفعتاً اسے لگا جھوٹ بولتے بولتے اس کی زبان بھی سفید ہو گئی تھی۔ پریشان ہو کر وہ پاس کھڑی گاڑی کے ونڈ مرر میں زبان دیکھنے لگا تھا۔

"کیا بات تجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے خیر دین میں تیرے بچپن کا سنگی بیلی ہوں مجھے تو اصل بات بتا تا کہ اس کا کوئی حل نکلے"۔ شیر سلطان اس کے گھر کے آنگن میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ بے بے رجو اور زرینہ جو صبح سے شیر سلطان کی خاطر مدارت میں مصروف تھیں ابھی ابھی اٹھ کر اندر گئی تھیں اور موقع غنیمت جان کر شیر سلطان نے بات چھیڑ دی۔

شیر سلطان خیر دین کے بچپن کا دوست تھا۔ اس کا باپ یہاں پر فورمین ہوا کرتا تھا جب خیر دین اور وہ بچے تھے۔ وہ ایک ساتھ مل کر یہاں سیر کو آنے والوں کا نظارہ کرتے تھے۔ انگریز ٹورسٹ کے ساتھ مل کر ان کے کیمرے سے تصویریں اتروانے انہیں سلوٹ مارتے اور ان کو دیکھ دیکھ کر ہنستے تھے لیکن یہ عرصہ بھی جلد گزر گیا تھا اور اس کا باپ کسی دوسرے شہر میں کسی اور فیکٹری میں ملازم ہو گیا تھا تو شیر سلطان بھی چلا گیا۔ شیر سلطان اچھی جگہ لگا ہوا تھا۔ اس کی رہائش ایک بڑے شہر میں تھی جہاں وہ نسبتاً خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ شیر سلطان نے اپنا رابطہ خیر دین سے بحال رکھا تھا خط و کتابت کے ذریعے اور کبھی کبھار اس طرف نکل آتا تو اس سے اور اس کے خاندان سے مل بھی جایا کرتا تھا۔ خیر دین کی عجیب و غریب بیماری کی خبر اسے پہنچی تھی اور وہ پہلی فرصت میں اس سے ملنے چلا آیا تھا۔

"میں اپنے عالم کے لئے پریشان ہوں شیر سلطان۔ میں نے ساری جوانی اس سفید زندان میں گزار دی۔ اپنے باپ کی لی ہوئی ہچکیاں اور کرتے کرتے اور اب کسی دن میں بھی کسی تودے تلے آ کر مر گیا تو میرے عالم کو بھی یہ سفیدی نگل لے گی"۔ خیر دین نے دل پر رکھی اپنے دکھوں کی گٹھڑی اپنے دوست کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

"یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کا حل نہ ہو۔ عالم کو اسکول بھیج پڑھ لکھ جائے تو کسی اور جگہ نوکری لگ جائے گا بڑا ہو کر" شیر سلطان نے لمحوں میں ایک عمر کے مسئلے کا حل بتا دیا تھا اپنے بچوں کی مثالیں دے کر "بڑا لڑکا خیر سے ہائی اسکول میں میٹرک کا امتحان دے گا اگلے سال اور اس سے چھوٹے دونوں بھی پڑھائی میں ہشیار ہیں تو انہیں میں اچھی تعلیم دلوا رہا ہوں آگے جو اللہ کی مرضی"۔ شیر سلطان کے چہرے پر اپنے بیٹوں کی بات کرتے ہوئے خوشی کے انوکھے رنگ دکھائی دے رہے تھے۔

"میں پڑھائی کا خرچ نہیں اٹھا سکتا ویسے بھی یہاں قریب لڑکوں کا مڈل درجے تک کا اسکول ہے شہر بھیجے اور آگے پڑھانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہاں تو سب کے لڑکے زیادہ سے زیادہ پانچویں تک پڑھ کر اسی جگہ بھرتی ہو جاتے ہیں"۔ خیر دین پھر گہری سوچ میں ڈوب کر تھوڑی دیر چپ ہو گیا اور پھر بولا "میں چاہتا تھا اپنے بیٹے کو اس تُف میں کوئی اور رنگ دے کر جاؤں یہ موت بھری سفیدی نہیں"۔ اس نے بات ختم کر کے پھر خلا میں گھورنا شروع کر دیا۔

"اگر تیرے ٹھیک ہو جانے میں صرف اتنی سی بات حائل ہے تو چل یہ مسئلہ تو حل سمجھ۔ میں عالم کا چاچا ہوں جیسے تیرا بیٹا ویسا ہی میرا بھی۔ میں اسے ساتھ شہر لے جاؤں گا اور وہیں اس کو وہیں جماعت تک پڑھاؤں گا اور

کہیں اچھی نوکری بھی لگوا دوں گا۔ کیا خیال ہے؟" شیر سلطان کی بات ختم کرتے ہی خیر دین اس سے لپٹ کر رونے لگ گیا۔

"میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا شیر سلطان اور اس کی تعلیم کی ایک ایک پائی ادا کر دوں گا۔"

"او چپ کر او ئے بکواس نہ کر۔ بڑا آیا ادائیگی والا۔ دوست کہتا ہے اور بیوپاریوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ بس پھر اب پکی بات ہے کہ عالم کو میں ساتھ لیتا جاؤں گا تو گھر والوں سے بات کر لے۔" شیر سلطان نے اس کے قدموں تک جھکے ہوئے خیر دین کو اٹھا کر گلے سے لگا کر تھپکی دی تو خیر دین کی آنکھوں کے سامنے زندگی کے رنگ اوڑھے سفیدی کہیں دور غائب ہو گئی۔

☆☆☆

رجو نے چپ سادھ لی تھی کہ یہاں فیصلے کا اختیار تو مردوں کو ہی ہوتا ہے اور خیر دین تھا بھی غصے کا ڈاڈھا بندہ۔ بیٹے کی جدائی نے اسے خاموش کر دیا تھا لیکن خیر دین بہت خوش تھا۔

"جو مستقبل تو بتا رہا ہے یہاں خیر دینا! اس میں تیرے بیٹے کو شاید پھل جائے پر تیرے پلے کچھ نہیں آئے گا" وہی الگ ہو ویلا مچانے میں لگی تھیں جن سے بستی کی عورتیں افسوس کرنے آئی تھیں کہ عالم خیر دین شیر سلطان کے شہر میں پڑھنے جا رہا ہے۔

"یہاں کیا برائی تھی؟ باپ دادا کا پیشہ ہے عزت کی روٹی ملتی ہے۔ اللہ نے تجھے بھاگ لگائے ہیں اب تو کام بھی آسان ہے۔ تیرے باپ دادا کے زمانے میں تو زیادہ مشکل تھا۔ ایک آنہ ملتا تھا اب تو روپے ملتے ہیں" بڑے چاچا بھی ناراض ہو رہے تھے۔ بڑے چاچا نے اپنے چاروں لڑکوں کو بھی مزدوری پر لگوا دیا تھا۔ ایک تو سرنگ کے اندر لیجانے والے لڑکے ٹرالی چلاتا تھا، دوسرا بڑے ٹرک کے گودے پر سائز میں کرنے پر تھا اور باقی دو چھوٹے تھے تو انہیں بھی پیسے کھدائی کے بعد دھونے کے کام پر چاچے نے لگوا رکھا تھا۔

"تجھے تو چار جماعتیں زیادہ پڑھوا لے گا تو عالم کوئی نواب تو نہیں بن جانا ہوئے سب مزدور ہیں تو محنت ہی اپنا پیشہ ہے" یہ بھی بستی کا کوئی بزرگ سمجھا رہا تھا لیکن وہ نہیں مانا اور یوں عالم شیر سلطان کے شہر آ کر گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔

عالم کے شہر چلے جانے کے بعد وقت کو بھی جیسے پر ہی لگ گئے تھے۔ زندگی جیسے اس کے بیٹے کے خطوں کے اور اسکے چھٹی آنے کے بیچ ہی میں اور جدائی کی کہانیاں سناتے گزر گئی تھی۔ اب خیرو کو بھی عمر کے اس حصے نے آن لیا تھا جب جوان بیٹے کی لاٹھی ہی زندگی کو آگے کھینچ سکتی ہے اور اس کا خط ہاتھ میں تھا۔ "آپ کی دعاؤں سے میری اب لیبارٹری میں کلرک سے سینئر کلرک کے عہدے پر ترقی ہو گئی ہے اور مجھے یہاں کالونی میں کوارٹر بھی رہنے کے لئے مل گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ، اماں اور زرینہ یہاں آ کر میرے ساتھ رہیں۔ زرینہ کی شادی بھی میں خود کروں گا اور آپ کی خدمت بھی۔" خیرو کو خط پڑھ کر سنانے والا ہمیشہ اشرف پوسٹ مین ہی ہوتا تھا۔

"مبارک ہو خیر دینا تیرے بیٹے کی ترقی بھی ہو گئی اور اب وہ تیرے بڑھاپے کا سہارا بھی ہو گیا۔ تیری محنت رنگ لے آئی" اشرف پوسٹ مین نے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خوشی کے آنسو۔ کتنا وقت بیت گیا تھا کل تک عالم یہاں دادی سے کہانیاں سنتا تھا، زرینہ کو تنگ کرتا تھا، علاقے کے اسکول ماسٹر سے شرارتیں کرتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا۔

"رجو! نیک بخت وہ مالک بخت ہمیں بلا رہا ہے اسے وہاں کوارٹر مل گیا ہے کہہ رہا ہے کہ۔۔" جوش جذبات سے خیرو کی بات ہی ادھوری رہ گئی۔

"میں سب سن رہی تھی۔ اللہ لمبی حیاتی کرے میرے بچے کی۔ بے بے ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔ اس دن کا اسے کتنا انتظار تھا" رجو نے دیکھا کہ زرینہ بھی مسکرا رہی تھی۔

مجھے سب سے زیادہ انتظار تھا کہ ٹھیک عمر میں اس سفید آسیب سے نکلنا چاہتا تھا اور بیٹے کو بھی اس کے چنگل سے آخر نکال ہی لیا میں نے۔ اللہ شیر سلطان کا بھلا کرے۔ وہ سوچ سوچ کر مسکراتا رہا۔

"شیر سلطان کو تو اللہ نے بھاگ لگا ہی دیئے۔ اسی لئے تو اب اس عمر میں وہ اپنے لڑکے کے پاس امریکا جیسے بڑے شہر میں ہے۔ میرے تو پیر سائیں نے رجے جیتے اسے دعائیں دی ہیں۔ اللہ اس کے بچوں کو شاد آباد رکھے" رجو نے دعائیں دینی شروع کر دیں تو وہ مسکرا دیا۔

زندگی نے ایک بار پھر کتنے حسین رنگ اوڑھ لئے تھے دور آسمانوں پہ تنی ہوئی قوس قزح کے رنگ۔

"دیکھا رجو میں کہتا تھا ناں میں اپنے بیٹے کو وہ سفیدی ہونے نہیں دوں گا" وہ سب لوگ اب کالونی میں داخل ہو چکے تھے اور خیر دین اتر کر کوارٹر کا جائزہ لینے لگ گیا۔ زرینہ اور رجو دونوں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں کہ انہیں وہ آتا نظر آیا۔ وہ اپنے گھر والوں کو دیکھ کر دیوانہ وار بھاگتا ہی چلا آیا۔ نیلے رنگ کی وردی میں سر پر چمکتی ٹارچ والی ٹوپی پہن کر جب عالم اپنے ابا، ماں اور زرینہ سے ملا تو نیلی ڈانگری پر سیاہ کوئلوں کا پاؤڈر اور اس کے بدن پر سیاہ نشانوں کو دیکھ کر رجو نے کلیجہ تھام لیا۔

"یہ کوئی فیکٹری ہے پتر جس میں تو کام کرتا ہے کہ تیرا منہ سر سب کالا سیاہ ہو رہا ہے" خیر دین نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"کول مائنز ہیں ابا جی۔ کوئلے کی کانیں ہیں۔ میں آپ کو کل اندر سے بھی دکھانے لے جاؤں گا" عالم اب ماں سے گلے مل رہا تھا۔

"یہ تو نے کیا کیا زرینہ کے ابا" رجو بیٹے کے گلے لگ کر روئے جا رہی تھی۔

سخنِ معطر

پروفیسر زُبیر گنجاہی

عاشقی میں جانے کیوں لوگ ایسا کرتے ہیں
آتے ہیں نہ جاتے ہیں' جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

سُر پھرا کوئی جب بھی اس نگر سے گزرے ہے
دیکھتے ہیں سب اُس کو' سب اُسی پہ مرتے ہیں

زلزلے جو آتے ہیں' لوگ کیوں بگڑتے ہیں
جو کبھی کیا تُو نے ہم وہی تو کرتے ہیں

حوصلہ نہ ہارو تُم' اِک گھڑی کی ظلمت سے
لڑنے والے موجوں سے ڈوب کر اُبھرتے ہیں

رزق ہے بندھا اپنا محنت اور مشقت سے
جو بھی کام کرتے ہیں وہی لوگ اُبھرتے ہیں

کیوں زُبیر کہتے ہو' بات تُم خدا لگتی
کیا بُرائی کر کے بھی آدمی سنورتے ہیں

O

کاوش پرتا پگڈھی

اب کہاں ہیں وہ سایہ دار درخت
ہائے کیا کیا تھے مشکبار درخت

ایک بھی تو نہیں ہے بارآور
اور آنگن میں چار چار درخت

پھل ابھی سے لگیں گے اس میں اگر
حسن کھو دے گا آبدار درخت

باغ سے کھیلتی ہے جب آندھی
ہو ہی جاتے ہیں ہمکنار درخت

فیض اٹھاتے جو وقت پر آتے
کس کا کرتے ہیں انتظار درخت

ایک دن وہ زمیں کو چومے گا
چاہے کتنا ہو پائدار درخت

باغباں سے ہیں کس لیے نالاں
باغ کے فربہ و نزار درخت

باغباں قہقہے لگاتا ہے
گر پڑے سارے باردار درخت

کس کی فرقت میں رات دن کاوش
روتے رہتے ہیں زار زار درخت

حصیر نوری

ضمیر دل اگر انسان کا مردہ نہیں ہوتا
کسی منزل پہ ایسا شخص بے چہرہ نہیں ہوتا

نہیں پہچانتا جو خود کو وہ اپنا نہیں ہوتا
سراپا عکس آراء آئینہ اس کا نہیں ہوتا

کوئی اندر سے کیسا ہے کوئی باہر سے کیسا ہے
زباں کھلتی نہیں تو اس کا اندازہ نہیں ہوتا

یہ باتیں عین فطرت ہیں شجر کے کاٹنے والو
خزاں کے دور میں زیرِ شجر سایہ نہیں ہوتا

رگِ جاں میں مری برقِ تپاں بن بن کے لہراتے
نہ بہتے آنکھ سے آنسو تو یہ اچھا نہیں ہوتا

ابھی تو میرے حصے میں ہے تیرا ہجر اے جاناں
سدا ہو ایک سا موسم کبھی ایسا نہیں ہوتا

ضرورت ہے کہ ہم رفتارِ عالم پر نظر رکھیں
یہ اچھا ہے ابھی طوفاں کوئی برپا نہیں ہوتا

وہ تنہا کر کے مجھ کو پائے گا کیا اے حصیر آخر
مری یادیں سلامت، میں کبھی تنہا نہیں ہوتا

O

صابر عظیم آبادی

دیے کی روشنی لگتی ہے اچھی
ادا جب آپ کی لگتی ہے اچھی

سبھی تو چاہتے ہیں مل کے رہنا
کسے یہ دشمنی لگتی ہے اچھی

کلی ہے پھول ہے خوشبو ہے تُو ہے
جبھی تو زندگی لگتی ہے اچھی

نہ جانے بعد میں کیا حال ہو گا
یہ دنیا تو ابھی لگتی ہے اچھی

کبھی تو تم خفا ہو جاؤ مجھ سے
تمہاری بے رخی لگتی ہے اچھی

بناوٹ جب نہیں ہوتی ہنسی میں
تو پھر ایسی ہنسی لگتی ہے اچھی

تمہیں اک چاہنے والے نہیں ہو
مجھے بھی زندگی لگتی ہے اچھی

گئے لمحوں کا غم شامل رہے تو
خوشی میں پھر خوشی لگتی ہے اچھی

مسرت اور الم دونوں میں صابر
ہمیشہ سادگی لگتی ہے اچھی

انور جاوید ہاشمی

بیادِ سلیم احمد

جانے یہ کیسی صدا ہے تانا ہوُ یاہُو
مجھ میں یہ کون چھپا ہے تانا ہوُ یاہُو

جانتے ہیں اسے اربابِ نشاط
مفلسی میں جو مزہ ہے تانا ہوُ یاہُو

کیوں زمیں جھول رہی ہے جھولا
چاند کیوں ناچ رہا ہے تانا ہوُ یاہُو

آؤ چلتے ہیں سمندر کی طرف
اُس طرف تازہ ہوا ہے تانا ہوُ یاہُو

آپ خودغرض نہیں میں بھی ہوں
میری مشکل بھی سوا ہے تانا ہوُ یاہُو

ہر طرف پھیلی ہے بارود کی بُو
رقصِ ابلیس روا ہے تانا ہوُ یاہُو

باقی کل سبھی دہرائیں گے
میں نے جو آج لکھا ہے تانا ہوُ یاہُو

O

ڈاکٹر حنیف ترین

لذت عطر فشاں ہو گی نہاں شام ڈھلے
لمس کے نور میں ڈوبے گا جہاں شام ڈھلے

سیر لب ہوں گے مرے ذائقۂ گُل منظر سے
رنگ بولیں گے کوئی میٹھی زباں شام ڈھلے

چاندنی جاگتے اعصاب پہ چھا جائے گی
جسم ہو جائیں گے پھر مشک فشاں شام ڈھلے

دھوپ پگھلا کے مجھے وصل کا موسم دے گی
زرد ہو جائے گا پھر رنگِ خزاں شام ڈھلے

جیرتی رات کی چیخوں میں ڈھلی ہو گی حنیفؔ
دل کی پامالیِ وحشت کی اذاں شام ڈھلے

شہاب صفدر

تم سے ممکن ہو تو سولی سے اتارو مجھ کو
ورنہ کج رائی کے خنجر تو نہ مارو مجھ کو

اپنے ہونے سے مجھے خوف بہت آتا ہے
سند بے ضرری چاہیے یارو مجھ کو

سیلِ موجود سے لیتے نہیں کیوں باہر کھینچ
اے مرے رفتہ و آئندہ کنارو مجھ کو

دم تمہارا ہی بھروں گا' رہا وعدہ' جو کبھی
ملی دم لینے کی فرصت مرے پیارو مجھ کو

میں بھی اک لمحۂ پُرکیف وطرب گیں ہوں شہابؔ
تپشِ غم سے اگر دور گزارو مجھ کو

حمیدہ معین رضوی

جس درد کو خود ہی پالا ہے، اس درد کا درماں کیا کرتے
جب قریہ دل پامال ہوا، تو وصل کا ارماں کیا کرتے

اس دشت میں تنہا چلتے ہوئے دن بیت گیا ہے شام کھڑی
اب اور کسی منزل کے لئے ہم راہ کا ساماں کیا کرتے

سب خواب جلا ڈالے ہم نے برسوں جو سجائے پلکوں پہ
تعبیر نہ تھی جن کی کچھ بھی، وہ خواب پرافشاں کیا کرتے

دل ٹوٹ گیا آنکھیں روئیں، ہم زہر خموشی پیتے رہے
چہرے پہ لکھی کلفت کو مگر اے قلب پریشاں کیا کرتے

آسیب زدہ ویرانی کا منظر ہے نگاہوں میں ٹھہرا
اب دل خود ایک خرابہ ہے ہم ذکر بیاباں کیا کرتے

سچائی دہائی دیتی ہے، انصاف سسکتا پھرتا ہے
اس جبر میں جیتے رہنے کی، خواہش کو فروزاں کیا کرتے

یہ کیسی بہار آئی اب کے، ہر سو ہی خزاں کے نوحے ہیں
جب گلشن گلشن مقتل ہو تو جشنِ بہاراں کیا کرتے

O

شارق بلیاوی

دل وہ کیا ہے جو آرزو نہ کرے
کچھ تمنائے رنگ و بو نہ کرے

زخمِ دل رہنے دے رفو نہ کرے
فکر اب کوئی چارہ جو نہ کرے

پیار کرتا تھا تجھ کو چھوڑ دیا
کیوں کروں کام وہ جو تو نہ کرے

تری آنکھوں سے پی چکا ہے بس
دل کو اب خواہش سبو نہ کرے

یہ رعائت نمازِ عشق میں ہے
بے مُصلے پڑھے وضو نہ کرے

حسن کے میکدے کا ہے دستور
جام چھلکائے ہاؤ ہو نہ کرے

ساری دنیا کی بات وہ کر لے
میرے مطلب کی گفتگو نہ کرے

اک زمانہ ہو جب تمنائی
ناز کیونکر وہ خوبرو نہ کرے

کام دل ہی بگاڑتا ہے سب
جیسا سوچوں یہ ہو بہو نہ کرے

دب کے رہ جائے خاک میں شارق
تجلی جو کوشش نمو نہ کرے

پروفیسر غفار بابرؔ

میری بات سُن لی جیو جاتے جاتے
بڑی دیر کی آپ نے آتے آتے

وہ آئے چلے بھی گئے قصۂ غم
انہیں رہ گئے ہم سناتے سناتے

نمازِ محبت قضا ہو گئی ہے
کہ ہم رہ گئے سر جھکاتے جھکاتے

میری شب گزیدہ سحر جاگ اُٹھی
مجھے دے کے تھپکی سُلاتے سُلاتے

وہ زہرابِ نفرت پلانے لگے ہیں
شرابِ محبت پلاتے پلاتے

کبھی رو پڑے ہم ہنساتے ہنساتے
کبھی ہنس پڑے وہ رُلاتے رُلاتے

یہ کیا ہو گیا ہے کہ پتھرا گئے ہیں
انہیں آئینہ ہم دکھاتے دکھاتے

کئی دیپ پلکوں پہ جلنے لگے ہیں
چراغِ شبِ غم بجھاتے بجھاتے

میری بات مانو حسینوں سے بابرؔ
چلو دامنِ دل بچاتے بچاتے

اکرام تبسم

تمناؤں کی آگ پانی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے
کوئی خوب صورت کہانی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے

ترقی کے رستے پہ چل کر بھی انسان غاروں میں رہتا
روایت کوئی بھی پرانی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے

تمہیں پڑھ کے سمجھے کہ دل اور آنکھوں کا مفہوم کیا ہے
یہ دُنیا تو کیا، زندگانی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے

ادھوری ادھوری ہر اک بات ہوتی زمانے کے لب پر
کسی نے کسی کی بھی مانی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے

یہ الفاظ بھی آدمیت کو دراصل تم نے دیے ہیں
محبت، وفا، قدردانی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے

کیا تم نے زلفوں کا سایہ سلگتے ہوئے موسموں پر
کوئی شام اتنی سہانی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے

انہی انتظاروں نے مستقبلوں کو حسیں کر دیا ہے
تبسم قیامت بھی آنی نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے

O

تابش خانزادہ

روح بیتاب ہوتی جاتی ہے
اک کھلا باب ہوتی جاتی ہے

آنکھ کھلتی ہے موت کے در پہ
زندگی خواب ہوتی جاتی ہے

گھر میں اب چاندنی نہیں آتی
دھوپ نایاب ہوتی جاتی ہے

نوجوانی کی تاپ کھو کر یہ
سانس برفاب ہوتی جاتی ہے

میرے اشکوں سے آنکھ کی کھیتی
آج غرقاب ہوتی جاتی ہے

تیری رحمت کے ابر سے میری
خاک سیراب ہوتی جاتی ہے

پھول چُبھنے لگے ہیں تابش کو
اوس تیزاب ہوتی جاتی ہے

O

شگفتہ نازلی

رُت تھی پھولوں کی سب سنورتے رہے
اُس کی رخصت پہ پھر بکھرتے رہے

دُور تک نقش پا کوئی نہ تھا
پھر بھی اُس راہ سے گزرتے رہے

رنج و غم اِس طرح ہوئے باہم
مرنے سے پہلے جیسے مرتے رہے

کام کرنا تھا جو وہ بھول گئے
جن کو کرنا نہ تھا وہ کرتے رہے

گرچہ ایسا کوئی گماں نہ تھا
پھر بھی کہنے سے پہلے ڈرتے رہے

ایسی سرگوشی اُس ہوا نے کی
سُن کے سب پھول تو نکھرتے رہے

حرفوں کی لَو کچھ اِس طرح اُبھری
اپنی ہی سوچ سے سنورتے رہے!

O

انجم جاوید

جس شاخِ گل سے گفتگو رعنائیوں کی تھی
اس شاخ پر نگاہ بھی بجلیوں کی تھی

ہم چپ رہے تو بانگِ جرس بھی رہے خموش
آواز دور تک نہ کہیں گھنٹیوں کی تھی

ہر آئینہ تھا سنگ کی زد میں نفس نفس
پھیلی ہوئی بدن میں صدا کرچیوں کی تھی

ہم پا برہنہ اس کے تجسس میں تھے رواں
رستے میں دھوپ بھی کڑی کٹھنائیوں کی تھی

ڈھارس بندھا کے تم نے مقدر بدل دیا
زنجیر میرے پاؤں میں محرومیوں کی تھی

گل چیں صفات ہاتھ کی زد پر تھی شاخِ گل
گلشن میں حکمرانی کہاں تتلیوں کی تھی

تقریبِ انبساط میں سب محوِ جشن تھے
شہنائیوں میں گونج مگر سسکیوں کی تھی

O

ڈاکٹر جواز جعفری

کہیں برجوں کے پڑاؤ میں، کہیں زیرِ آب جگہ جگہ
مرے چارسُو ہے کھلا ہوا وہی اک گلاب جگہ جگہ

کسی اور دُنیا کی رات میں نئی دہر کے مضافات میں
کسی آسماں پہ تھا ضوفشاں وہی ماہتاب جگہ جگہ

اُسے چھوڑ کر پسِ خاکداں جونہی پہنچا میں سرِ آسماں
مرے سامنے تھی کھلی ہوئی وہی اک کتاب جگہ جگہ

کہیں پک رہا ہے وہ ریت میں، کہیں زعفران کے کھیت میں
کسی کارگاہ کے بھید میں کوئی انقلاب جگہ جگہ

ہو کے تیری آنکھ سے دربدر ہے پکڑنے کو کہیں اور جر
کسی چشمِ سبز کی خاک میں مرا نخلِ خواب جگہ جگہ

تہی دل تھا میں تہی دست تھا، مری آنکھ میں مرا دشت تھا
سو بچھا رہا مری راہ میں وہی اک سراب جگہ جگہ

جاوید منور انجم

فن مرا ایسا ہے جو خونِ جگر مانگتا ہے
اک زمانہ ہے کہ اب میرا بھی سر مانگتا ہے

گلشنِ وقت میں ایسی ہے فضا کہ پنچھی
اک نیا اپنا چمن اور شجر مانگتا ہے

رات ہی رات میں جو اس کی بدل دے قسمت
نوجواں آج کا ایسا ہنر مانگتا ہے

اب قفس سے تو نکل آیا ہے پنچھی لیکن
پھر سے اُڑنے کے لئے اپنے وہ پَر مانگتا ہے

ہر طرف امن کے دنیا میں ہیں اب پھول کھلے
اب زمانہ بھی کوئی ایسی خبر مانگتا ہے

ایک دیوانہ ہے جو میرے شجر سے انجم
جو کہ لگتا ہی نہیں ایسا ثمر مانگتا ہے

احمد ظہور

لکھ دیے جب خواب کاتب نے میری تقدیر میں
رکھ دیے پھر خواب ہی کچھ خواب کی تعبیر میں

میری آزادی کی خواہش پر میرے صیاد نے
چند حلقے اور شامل کر دیے زنجیر میں

بے گناہی اب تو ثابت ہو گئی میری مگر
نذرِ زنداں ہو گئی اک عمر کس تقصیر میں

ہو سکا نہ کچھ بھی اُن پر میری آہوں کا اثر
چل رہا ہوں آپ اپنی آہ کی تاثیر میں

سامنے آئینۂ دل کے ٹھہر جاؤ ذرا
دیر لگتی ہے بدلتے عکس کو تصویر میں

اک جہاں میرا بصورت سنگ و خشت و آب و گل
اک جہاں آباد میرے جذبۂ تعمیر میں

ہُما اعظمی

ترے حساس سینے پر مرے اشکوں کا ساون ہے
مری پائل کی چھن چھن سے تیری سانسوں میں الجھن ہے

ترے لفظوں کی گرمی سے تخیل شعر بنتا ہے
تیری شیریں بیانی سے مری غزلوں کا گلشن ہے

ترے دل تک رسائی کی ہر ایک ناکام ہے کاوش
ترے شاداب سینے پر سنہری آگ روشن ہے

مقاصد کے ترازو میں کبھی رشتے نہیں رکھو
رفاقت کے روابط میں محبت بھی تو ایک فن ہے

سنو! ہر سال آتی ہے یونہی سردی دسمبر میں
مگر سورج کی حدت میں رفاقت کا نیا پن ہے

مری آزاد فطرت کو زباں بھی اور قلم حاصل
مگر آنکھوں میں آنسو کیوں مرا تو جسم آہن ہے

ہُما جس دھن میں کہتی ہے کبھی چاہت بھری غزلیں
اسی لے پر بکھرتی ہے جو تیرے دل کی دھڑکن ہے

سید مقبول عابدی

(کیوں کیا جاتا ہے انکار سمجھتا ہی نہیں ... محسن بھوپالی)

خامشی ہوتی ہے اقرار سمجھتا ہی نہیں
میں سمجھتا ہوں دلِ زار سمجھتا ہی نہیں

جانے وہ کون سی تہذیب کا پروردہ ہے
میرا اخلاص مرا پیار سمجھتا ہی نہیں

جنسِ بازار نہیں دولتِ افکار و ہنر
لیکن اس دور کا فنکار سمجھتا ہی نہیں

آپ کو مالک و مختار حریم دل کا
مانتا بھی ہوں میں سرکار سمجھتا ہی نہیں

وائے برقیں کجا دشت کجا پردہ نشیں
سب سمجھتے ہیں مرا یار سمجھتا ہی نہیں

وقعتِ درہم و دینار پہ مرنے والا
حرمتِ سیرت و کردار سمجھتا ہی نہیں

خاک سمجھے گا وہ مقبول ترے دل کی زباں
جو سخنگر ترے اشعار سمجھتا ہی نہیں

O

پرویز ساحر

دِل کہیں اور تو ذہن اور کہیں رہتا ہے
بارے اب تو مجھے کچھ یاد نہیں رہتا ہے

یُوں مری آنکھ میں رہتا ہے وہ آنسو بن کر
جیسے انگشتری میں کوئی نگیں رہتا ہے

عجب انکار کی خُو پائی ہے اُس کافر نے
اُس کے ہونٹوں پہ سدا لفظ "نہیں" رہتا ہے

یہ جو اِک قریۂ تاریک ہے اِس قریے میں
سُنتے ہیں اب بھی کوئی ماہ جبیں رہتا ہے

ہم کہ مخلوق ہیں اور فرش ہے مسکن اپنا
وہ کہ خالق ہے سرِ عرشِ بریں رہتا ہے

اب یہ عالم ہے کہ میرے دِلِ وحشت زدہ کو
بدگمانی میں بھی یک گُو نہ یقیں رہتا ہے

جو کہ منشورِ محبت پہ سدا چلتا رہے
میرا ایماں ہے کہ وہ شخص حسیں رہتا ہے

یہ خرابہ مرے ہونے سے ہے آباد ابھی
کہ یہاں مجھ سا کوئی گوشہ نشیں رہتا ہے

تُو کہ ہر آنکھ پہ ظاہر نہیں ہوتا ساحرؔ
کسی چشمے کی طرح زیرِ زمیں رہتا ہے

اوصافؔ شیخ

دریدہ دامن کا خواہشوں سے مقابلہ ہے
مرا مقدر کی سختیوں سے مقابلہ ہے

جلاؤں اچھے دنوں کی امید کے دیئے میں
اگرچہ دن رات آندھیوں سے مقابلہ ہے

میں پتھروں کو ہرا کے آگے بڑھا تو دیکھا
کہ دور تک میرا آئینوں سے مقابلہ ہے

گلی گلی لے کے پھر رہا ہوں دریدہ دل کو
قدم قدم جس کا سازشوں سے مقابلہ ہے

میں گھر سے نکلا ہوں ایک کاغذ کی ناؤ لے کر
وہ جس کا بپھرے سمندروں سے مقابلہ ہے

مجھے بھی اوصافؔ ہے یہ کارِ ثواب حاصل
مرا بھی غالب کے دشمنوں سے مقابلہ ہے

احسن سلیم

بابِ رحمت کھلا نہیں کوئی
جیسے میرا خدا نہیں کوئی

مجھ میں باقی رہا نہیں کوئی
مجھ سے باہر فنا نہیں کوئی

خاک پر بھی زوال آتا ہے
دشت ہم سے جدا نہیں کوئی

غم کا نشہ شدید ہوتا ہے
ایسا نشہ کیا نہیں کوئی

وہ بھی ہم سے عناد رکھتے ہیں
جن کا اچھا بُرا نہیں کوئی

جیسا احسنؔ سلیم شاعر ہے
ایسا شاعر ہوا نہیں کوئی

نوید سروش

رستا بدل رہا تھا
نقشہ بدل رہا تھا

اب گفتگو میں اُس کا
لہجہ بدل رہا تھا

میں اپنے آپ کو بھی
تجھ سا بدل رہا تھا

پہنچا تھا دیر سے پھر
حیلہ بدل رہا تھا

وہ لڑ رہا تھا شاید
رشتہ بدل رہا تھا

خوابوں کی آرزو میں
تکیہ بدل رہا تھا

حیراں تھے لوگ اُس پر
ایسا بدل رہا تھا

ہر بار وہ نیا اک
چہرہ بدل رہا تھا

شاموں میں تھا ترنم
نغمہ بدل رہا تھا

میں تو کتابِ دل کا
صفحہ بدل رہا تھا

اک نام کو بدل کر
جھگڑا بدل رہا تھا

کردار مر چکے تھے سب
قصہ بدل رہا تھا

جب ہو گیا دھماکا
جلسہ بدل رہا تھا

ٹوٹا یقیں پھر اُس کا
دھوکا بدل رہا تھا

تُو اپنے آپ کو بھی
مجھ سا بدل رہا تھا

بس ہو چکا تماشا
دھکا بدل رہا تھا

وہ مخبری کے ڈر سے
ڈیرا بدل رہا تھا

مِلنا نہیں تھا اُس کو
عشوہ بدل رہا تھا

سچائی کُھل رہی تھی
حلقہ بدل رہا تھا

تختی بدل رہی تھی
تختہ بدل رہا تھا

ارماں مچل رہے تھے
سینہ بدل رہا تھا

باتیں بتا رہی تھیں
خدشہ بدل رہا تھا

کرسی بدل رہی تھی
سکّہ بدل رہا تھا

تیور بتا رہے تھے
غصہ بدل رہا تھا

حاکم بدل رہے تھے
قبضہ بدل رہا تھا

لڑکی سنبھل رہی تھی
لڑکا بدل رہا تھا

جھوٹے بدل رہے تھے
سچا بدل رہا تھا

دولت لٹا رہے تھے
مجرا بدل رہا تھا

رسمیں نبھا رہے تھے
شجرہ بدل رہا تھا

سڑکیں لہو میں تر تھیں
بلوا بدل رہا تھا

قبریں وہی تھیں لیکن
کتبہ بدل رہا تھا

خاموش تھیں زبانیں
جذبہ بدل رہا تھا

تھا خوف ڈوبنے کا
نیّا بدل رہا تھا

گھر کر وہ دوستوں میں
کونا بدل رہا تھا

حکمت نہ چل سکی تو
نکتہ بدل رہا تھا

اوقات بھول کر وہ
کیسا بدل رہا تھا

زردار بن گیا تو
پیشہ بدل رہا تھا

میں محوِ خواب تھا پر
سپنا بدل رہا تھا

وہ کس کی جستجو میں
خطہ بدل رہا تھا

میں سامنے تھا اُس کے
حملہ بدل رہا تھا

مسمار کر کے بستی
غلبہ بدل رہا تھا

بے جان جسم پر بھی
ورثہ بدل رہا تھا

خوفِ سزا تھا اُس کو
خطبہ بدل رہا تھا

حالات دیکھ کر وہ
شکوہ بدل رہا تھا

چہرے کو دیکھ کر وہ
مکّا بدل رہا تھا

یادیں ستا رہی تھیں
کیا کیا بدل رہا تھا

ایک طویل غزل سے ۴۶ اشعار

یوگی کے نام

ریٹافلپس Reta Philips امریکی خاتون کے چند خطوط

ڈاکٹر مدن لعل گلاٹی

یکم ستمبر

منتشر خیالات اور بکھرا جہانِ تصورات میں گم۔ میں خود غرضی کے خیالوں میں مدہوش و مست جھوم رہی ہوں۔ اس اُمید میں ہوں کہ تم ہوائی جہاز میں نہیں ہو کتنا عجیب طریقہ ہے خط کے آغاز کا ...... پھر تصورات میں گم ..... میرا ذہن یکجا نہیں ہے ..... دوبارہ ملاقات کرنا، شاید زیادہ موزوں ہے۔ دوپہر کے کھانے کی یادیں مزہ دے رہی ہیں۔ حیران ہو رہی ہوں میں تمہاری شاعری کی نفاست کی خوبصورتی بھی جان سکوں گی۔ تمہاری تحریر میں شاید میرے ہی دل کی آواز ہے تبھی دل کو چھو کر گزرے ہوئے لب ہم سمندر کا ذکر نہیں کر پائے گے۔ میں تصور کر رہی ہوں کہ میں اس ہفتے شو اور ریسٹورن جاؤں گی اور تم میرا اپنی میز پر انتظار کر رہے ہو گے ..... سوچ رہی ہوں کہ تم ابھی نہیں گئے ہو گے ..... مگر تم نے یکم ستمبر کو بھارت کے لئے اُڑان لی تھی۔

افسوس! میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم گہری نیند میں ہو گے۔ چالیس ہزار فٹ بادلوں سے اوپر ..... ستاروں بھری رات میں جیسے فرشتوں نے اپنے سہارے اپنی پناہ میں رکھا کہ تم اپنے پیارے وطن بحفاظت پہنچ جاؤ۔ میں تمہیں ملنے کے لئے بیتاب ہوں۔ میں تمہارا وطن دیکھنے کے لئے بے قرار ہوں۔

۳ ستمبر

چاند اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ اور اپنی چاندنی وادی میں بکھیر رہا ہے۔ اس کے پر اسرار سائے شاہ بلوط کے پیڑوں کے جھنڈ میں رقصاں ہیں اور سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ "سنا نہیں، باہر آؤ ہمارے ساتھ کھیلو"

ہر شام میں اپنے چند گانے والے دوستوں کے ہمراہ ریسٹورن گئی۔ میں نے بیرے کو دیکھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا فون آیا تھا۔ تم بحفاظت وطن پہنچ گئے ہو۔ میں سُن کر خوش ہوئی۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمہیں بے حد چاہتا ہے اور اُسے تمہارے ساتھ بے پناہ خالی پن محسوس ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ تم اس کے پاس ہوتے۔ اب ہم دونوں یہی چاہتے ہیں۔

۶ ستمبر

اُمید! تمہیں معلوم ہے کہ اُمید کس قدر مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ جب کوئی امید کرتا ہے تو تصورات کی اپنی ایک دُنیا بسا لیتا ہے اُسی میں وہ رقصاں رہتا ہے۔ خود کو اس طرح احساس دلانے کی سعی کرتا ہے کہ جو وہ چاہتا ہے ویسا ہی ہونے والا ہے۔ طلسم ہوش ربا میں گم کہ تم نے فیصلہ کر لیا ہو گا کہ تم ایک ہفتہ یا دو یا پھر ہو سکتا ہے مہینہ بھر کے لئے اپنا سفر ملتوی کر لیا ہو گا ..... اور تم رُک جاؤ گے کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ خیال ہے کہ تم یہاں ہو ..... لیکن تم یہاں ہو میرے پاس میری نظروں کے سامنے ...... اُف کس قدر خوبصورت سوچ ہے .....!!!

میرے ذہن میں ایسے کتنے ہی خیالات یکجا ہوں گے اور ایک بھی لمحہ ضائع نہیں ہو گا کہ ہم کوئی موقعہ آپس اور خوشیاں دُنیا میں بانٹنے کا گنوائیں اور اس کے لئے میں تمہاری بے حد ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اکسایا کہ میں اپنی لائبریری میں جاؤں اور جو تحریریں میری ابھی تک شائع نہیں ہوئیں اور جو میری بڑی الماری میں احتیاط سے پڑی ہیں ..... میں نے ایک دن اُن میں جھانکا تو سب صفحات اُدھر اُدھر تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ سوچ رہی ہیں کہ اس انتظار میں ہیں کہ کوئی انہیں از سرِ نو زندگی دے۔ شاید وہ بھی خوب ہیں کہ ان کو بھارت کی سیر کا موقع ملے گا تا کہ وہ یوگی کی نگاہوں کے سامنے ہوں اور وہ انہیں دیکھ رہا ہے، سونگھ رہا ہے، پڑھ رہا ہے ....

۱۱ ستمبر

آج میں نے سوچا محسوس بھی کیا کہ میں نے تم کو کتنا ہے تمہاری موجودگی شدت سے محسوس کی ہے۔ شاہ بلوط کے پیڑوں کی آرائش کی خوشبو، اس پہاڑی جگہ پر اپنے سبزہ زار میں۔ اور مجھے کم و بیش یقین کامل تھا کہ ایک خوبصورت کبھی دُم ہلاتی گلہری میرے سامنے آئی میری کار کے ونڈ شیلڈ پر اور اس نے مجھے تمہاری جانب سے پیار کرنے کے لئے ..... کیا تم کو گل کے پھول نے سرگوشی کی دوسری جانب سے پیار کیا ....

۱۱ اکتوبر

بہت ہی پیارے یوگی	بعد از بہت سی نیک خواہشات کے عرض ہے

۱۱ اکتوبر ۲۰۰۶ء پورے تیس یوم بعد ۱۱ ستمبر جب تم نے خط لکھا

آج پھر بھارت میرے پاس آ گیا ہے۔ اس بار میرے خطوط کے بکس میں اور میں ایک ننھے بچے کی مانند جس کو اپنی پسندیدہ مٹھائی کی گولی ملی ہو۔ میں اپنی کار کے پاس چلی گئی جو کہ ڈاک گھر کے پاس کھڑی تھی اور اس کو کھولنا شروع کر دیا۔ بیس منٹ کی کار کی مسافت کا خیال کہ گھر جا کر چائے بنا کر دھوپ میں بیٹھوں مشکل بہت آمیز نظر آیا کہ یہ انتظار میرا آزما تھا میرا اشتیاق میری زندگی کے تو اعد و ضوابط پر سبقت لے گیا اور کم و بیش میری خوشیاں جن کو میں بتا کر دیتی ہوں۔ میں نے کام میں بیٹھے ہی تمہارے خط کا مطالعہ شروع کر دیا ایک ننھے بچے کی طرح۔

ایک ایک لفظ مزے سے پڑھا جو خط تمہارے خوش خطی کا نمونہ کاغذ پر خوبصورت ڈاک ٹکٹ لفافے پر تمہاری روح لکھے ہوئے الفاظ میں سے سرگوشیاں کر رہی تھی ..... اور تم ..... تمہاری تصویر ..... آہ کس قدر خوش کن تھی۔ خط کے آخری صفحے کی پشت پر ..... تم شاید کچھ کھا رہے تھے کوئی خاص مزے دار شے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے کہا تھا کہ تمہیں دن بھر کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے کی عادت ہی ہے۔ (میں نے بھی ابھی ابھی چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا کھایا ہے جو مجھے کسی نے ہسپتال میں دیا تھا جب میں نے اس کی پسند کا گانا گایا تھا) دیکھا میں بھی اس طرح سے کھاتی ہوں۔

میں نے خط کو مکمل طور سے پڑھ لیا ہے اور تم میرے سامنے مسکرا رہے

جو تم بھی رہے ہو، وہاں میں بھی اب مجھے جلد از جلد گھر جانا ہے اور خط کا جواب لکھنا ہے۔ اس سے پہلے کہ زندگی کی مصروفیت اپنے میں سمو لے...... اس وقت رات کے دس بجے ہیں اور میں خود کو لکھنے کے لئے تیار کر رہی ہوں، کمپیوٹر کے الفاظ ٹائپ کر رہی ہوں۔ یہ ہاتھ سے لکھنے سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ اور پھر اس وقت تاخیر بھی ہو رہی ہے۔ تمہارے خوبصورت خوش خط کو دیکھ کر مجھے اچھا لگا ہے۔ حیران ہو رہی ہوں کہ تم اس وقت کون سی اچھی سی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہو۔ اس وقت تمہارے دیش میں کیا وقت ہوگا۔ تم وقت گزاری کے لئے کیا کر رہے ہو گے۔ میں نے تو بہت بار تمہیں لکھنے کے لئے قلم اٹھایا مگر کوئی نہ کوئی کام پڑتا رہا۔ زیادہ تر تو میں کوئی خاص چیز تمہیں بنا کر پیش کرنا چاہ رہی تھی لیکن پھر تمہارا خط پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کچھ بھی دل پذیر ہوگا جیسا کہ میں نے تمہارا پیارا خط پا کر محسوس کیا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے فن کے کمال کو تیاگ دیا اور میں نے سوچا کہ کچھ بھی تجربہ ہو سکتا ہے کیونکہ کبھی کبھی بندش حائل ہونے سے شے کا مزہ جاتا رہتا ہے جیسا کہ تم نے لکھا تھا۔ میں اس کے لئے تمہاری بے حد ممنون ہوں۔ میرے پیارے یوگی! تمہاری شب آفرینی کی نثر مجھے جہانِ تصورات میں اڑا لے گئی۔ اور جانے کہاں کہاں رقص کرتی رہی، گاتی رہی، گھومتی رہی۔ دوستوں کے ہمراہ تم شو اور ریستوران کھانے کے بعد برش سے ملی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم خیریت سے وطن پہنچ گئے ہو۔ میں گھر آئی، میں نے حتیٰ کہ بتی نہیں روشن کی تھی۔ باہر خوبصورت چاندنی رات میں سرپاشی کر رہی تھی۔ جھینگروں کی دھن بھی معلوم ہو رہی تھی۔ جادوئی ستاروں بھری رات درخشاں تھی۔ ناگہاں ایک خوبصورت ستارہ ٹوٹتا ہوا گزر گیا اور پھر میں کمرے میں گئی اور اپنے خیالات قلمبند کر دیئے۔ شاید تم اس وقت صبح کا ناشتہ کر رہے ہو گے، میں نے سوچا۔

یوگی یقین کرو کہ تمہارا خط پا کر میں بے حد مسرور ہوئی ہوں اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا ہے۔ معذرت کی کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن میں مانتی ہوں کہ جب ہم جدا ہوئے کھانا کھانے کے بعد میں حیران ہوں کہ شاید میں نے کہیں تمہارے گلے لگ کر کوئی مذہبی، اخلاقی غلطی تو سرزد نہیں کی۔ مگر میں کسی حالت میں بھی تم سے گلے ملے بغیر تم سے جدا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میں امید کرتی ہوں کہ میں نے آپ کا خوش یا ناراض نہیں کیا۔ مگر ایسی کوئی بات ہے تو تم میری اس بچگانہ حرکت کو درگزر کر دو کیونکہ یہ میرے سچے پیار کا انسانی جذبہ تھا۔ اخلاقی طور سے میں صاف گو ہوں۔ میں تمہیں بیٹھے لگے بغیر بھارت نہیں روانہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر جب ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو یقیناً میں نے اپنے اندر ایک عجیب قسم کی غلطی کا احساس محسوس کیا۔ اور جب میں نے تمہارا خط پڑھا جب تم نے ایک شعر کا ترجمہ کیا: ہم دل کو بیچتے ہیں، کوئی اس کو مول لے۔ اس کا بس ایک مول ہے، کوئی قسمت کے بول لے۔ اور میں نے پڑھ کر خوب ہنس رہی تھی۔ تم دیکھ رہے ہو؟

جب سے تم گئے ہو میں بے حد مصروف رہی، بیشتر طور سے میری ممی کی وجہ سے جو کہ میرے پاس آ رہی ہے۔ اس نے اب مجھے اکتوبر کی تاریخ دی ہے۔ اس کے آنے سے قبل مجھے اس کے لئے اپنی ٹکٹ کا بندوبست کرنا ہے اور اس کے گھر کو تیار دانش عطا ہے۔ میں کمزور ضرور نظر آتی ہوں مگر میں ہر حال میں گھر کے ہر کام میں خود کو چاک و چوبند رکھتی ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں نے اپنے بیٹی کے ساتھ قانونی کام کیا ہے۔

بس کسی طرح میں زندگی کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرے پاس ایک کلب ہے جسے میں نے ہسپتال کے لئے تیار کیا ہے۔ جس میں میرے کو ان تجربات ہیں لگانے چلانے والوں کے ساتھ جس کو ہر حال میں ماہ اکتوبر میں مکمل ہونا ہے۔ اور میں پچھلے دنوں کئی دیگر کاموں میں مشغول رہی ہوں۔ ان گروپوں میں میرے ساتھ پیانو، بانسری، طبلہ، گٹار اور دیگر کئی اقسام کے کلاکار ہیں۔ یہ خوب مشرق و مغرب، ینگ پیک سب کچھ ایک میں ہی ہے۔ اچھا سنگم ہے۔ جس کی اچھی آمیزش ہوگی۔

مجھے تمہارا بہت سارا شکریہ ادا کرنا ہے کیا یہ ایک حیران کن تصادم نہیں ہے۔ ایک عجیب سی دل لگی ایک گرم جوشی اس طرح جوش پیدا کر دے گی آتما میں ایک زندگی کا نازک بھر دے گی کون کہہ سکتا ہے کہ اس دن میں نے بڑی سے بڑی یہ دریافت کرنا چاہا تھا کہ مجھے محبت کیا کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے اور پھر اس کے بعد اس طرح سے خوبصورتی ہماری زندگی میں بہتی چلی آئے گی اور جب اس نے مجھے محبت کیسا ہی اور کیا کہ اس نے اپنے والدے منگوائی ہے۔ میں نے محسوس کیا بھارت میرے در پہ میرے پاس آ گیا ہے۔ میں ہر صبح اسے پڑھتی اور محسوس کرتی کہ بھارت نے مجھے آغوش میں لینے کے لئے بازو پھیلا دیئے ہیں اور میرے سامنے اصول ترانے کھول دیئے ہیں۔ دل کھول کر اور مکمل کشادہ دلی کے ساتھ میں نے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا...... اور پھر تم اس بھارت نے تمہیں بھیج دیا۔ اور مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔

دھند پہاڑوں پر پھیلتی جا رہی ہے جو چاندنی کو اور بھی روشن کر رہی ہے۔ جھینگر و پھر اپنی سریلی آواز میں نغمگی پیدا کر رہے ہیں۔ اور شالوط کے پیڑ سے جو سوئج کی تازگی کی خوشبو سے تر ہیں رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ اور تم میرے خیال سے بہت اچھی سی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہو یا شاید تم دوپہر میں ستار بجا رہے ہو گے۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم نے مجھے فون کیا اور میں مل نہ سکی۔ میں نہیں جانتی کیا ہوا ہوگا۔ جب میں اپنے کاموں سے کچھ فرصت پا لوں گی میں تمہیں فون کروں گی اور پھر ہم تصورات میں کھو کر زندگی کے کچھ پل فون کی ہری تار سے رابطہ قائم کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری تصویر دیکھ رہے ہو گے۔ میرے پاس بھی ایک تھی اس وقت تک میرے پاس ٹکٹ کے تو زیادہ نہیں ہیں۔

تمہارے خوبصورت تحسین و آفریں کے خط کے لئے تم نے مجھے سراہا ہے۔ میں یہ پڑھ کر بے حد خوش ہوں کہ تم نے میرے ہنر کی تعریف کی اور کہ تم اس میں کھو گئے اور میرے سنگیت نے تمہارے دل کو چھو لیا۔ میں معذرت خواہ ہوں جیسے کہ تم نے لکھا ہے کہ میں فریب کاری اغوا کرنے والی ہوں کہ میں نے تمہاری آتما کو اغوا کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھ میں اس قدر قابلیت ہے۔ میرا خیال ہے میرے خطوط اب تمہیں تمہاری آتما لوٹا دیں گے...... اور تمہیں ایک دو نظم کے لئے اکسائیں گے بھی......!!!

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

غلام الثقلین نقوی کی رنگینیات

اردو ادب کے افسانوی ورثے میں دیہاتی زندگی کی سچی، سادہ اور حقیقی منظر کشی جس عمدگی سے جناب غلام الثقلین نقوی مرحوم و مغفور نے کی ہے اس کی مثال برصغیر میں کم کم اور وطن عزیز میں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ ہر چند نقوی صاحب مرحوم افسانوی ادب میں بلند مقام کے حامل افسانہ نگار تھے مگر فن کی حیثیت کے مطابق انہیں وہ مقام و مرتبہ نہ ان کی زندگی میں ملا اور نہ بعد از زندگی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اردو ادب کے ہر باخبر اور صاحب علم فرد کو یہ علم ہے کہ غلام الثقلین نقوی صاحب جس طرح افسانے میں دیہی زندگی اس کی تمام تر خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے ساتھ سادگی اور سچائی اور ہنرمندی سے پیش کرنے پر قادر تھے عین اسی طرح انہیں دیہی زندگی کو ناول کے جامے میں قید کرنے کا فن بھی فیاضی سے ودیعت ہوا تھا۔ نقوی صاحب کا قلم دیہی زندگی کو رقم کرتے کرتے اکثر برش اور کبھی کبھی کیمرہ بھی بن جاتا تھا جس کے باعث ان کی تحریر لفظوں اور حروف تک محدود رہنے کے بجائے مجسم شکل اور مکمل وجود کا روپ دھار لیا کرتی تھی۔ پڑھنے والے کو وہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دکھائی دینے لگتا تھا جو غلام الثقلین نقوی صاحب قرطاس پر تحریر فرمایا کرتے تھے۔ نقوی صاحب کے تراشیدہ ان گنت اور لاتعداد کردار آج بھی ان کی کتابوں میں رچے ہوئے زندگی اور زندہ دلی کو آواز دے رہے ہیں۔

نقوی صاحب کے احباب اور قارئین کی کثیر تعداد میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو غلام الثقلین نقوی کی کالم نگاری سے باخبر نہیں ہیں۔ حیاتِ زندگی کے آخری ایام میں نقوی صاحب نے اپنے تاثرات اور مشاہدات کو اخباری کالم کا پیراہن عطا کیا تھا جنہیں ان کے لائق فرزندان نے "پانچواں موسم" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کرکے اپنے لائق و محترم والد کی روح کی تسکین کا سامان تو کیا ہی ہے نقوی صاحب کے قارئین، احباب اور دوستوں پر ایک اضافی کرم فرمائی یہ بھی کی ہے کہ نقوی صاحب کے پچیس منتخب افسانے ایک جلد میں شائع کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نقوی صاحب کا اپنے پڑھنے والوں سے رشتہ مضبوط کردیا ہے۔ دونوں قابلِ اعتبار کتب ساتھ روایت کی پیروی میں انتہائی صاف، شستہ اور دیدہ زیب ہیں۔ پچیس منتخب افسانوں پر مشتمل کتاب کی ضخامت تین سو بہتر صفحات اور قیمت تین سو پچیس روپے ہے جبکہ اسی کے قریب منتخب اخباری کالم کا نسخہ دو سو چالیس صفحات کا حامل ہے جس کی قیمت ایک صد پچاس روپے مقرر کی گئی ہے۔ دونوں کتابیں کاغذی پیرہن، عظیم مینشن، رائل پارک، لاہور کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہوئی ہیں اور انہی کے توسط سے طلب کی جاسکتی ہیں۔

پنہاں کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اردو ادب کے ایسے محقق، نقاد اور ادیب و شاعر ہیں جنہیں قدرت نے ذہنِ رسا کے ساتھ انتھک محنت اور مسلسل کام کرنے کا ایسا جذبہ عطا کیا ہے جو انہیں ہر وقت، ہر دم اور ہر گھڑی متحرک رکھتا ہے۔ "پنہاں کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ" بھی ڈاکٹر صاحب کی اسی جستجو، لگن اور اشتیاق کا ثمر ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے بیگم ساجد پنہاں کی شاعری کے رجحانات، میلانات، موضوعات، تکنیک، تراکیب اور پنہاں کی زبان و بیان کو تفصیل سے بحث کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پنہاں کے چار شعری مجموعوں تک خود کو محدود کرنے کے بجائے تخلیق کار سے تفصیلی انٹرویو کی روشنی میں زیرِ نظر کتاب کو تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول پنہاں بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہیں اور جن کا مطالعہ دلچسپ حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب محترم پنہاں صاحبہ کی شاعری بالخصوص غزل کے حوالے سے فرماتے ہیں "پنہاں ذاتِ فطرت اور معاشرے کا رخ کی کیونکہ وحدت سے منسلک نہ کرتے ہوئے بھی زمان و مکان کا پابند ضرور رہتی ہیں اور دعوئی یا اعلان کے بغیر بھی ان کی شاعری سماجی رابطوں سے سروکار رکھتی ہے" پنہاں کی نظموں کے حوالے ڈاکٹر صاحب کا فرمان یہ ہے "نظم نگاری میں بھی پنہاں کی خاص اہمیت اور انفرادیت ہے۔ غزل کی اساس جذبے اور احساس پر ہوتی ہے جبکہ نظم کی اصل قدر و قیمت اس میں مضمر خالص شاعری کے فکری عنصر پر منحصر ہوتی ہے۔ پنہاں کی نظم میں جذبۂ احساس اور فکر کا متوازن امتزاج پایا جاتا ہے اور یہ خاص وصف ان کی نظموں کو انفرادیت بخش رہا ہے۔ زندگی کے اقدار سیکھنے کی شوقین پنہاں صفحۂ ہستی پر لکھی تحریریں پڑھنے کی کوشش میں فلسفہ، سائنس اور مذہب کی عینکیں بھی جا بجا آزما کر اپنے تخیلات کی روشنی سے بھی مدد لیا کرتی ہیں۔ پنہاں کو علامتیں برتنے کا فن بھی مہارت سے آتا ہے اور رومانی طرزِ احساس نے ان کی نظموں کو خوبصورت تخلیقی پیراہن عطا کیا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ بیگم ساجد پنہاں کی شاعری کو بہتر طور پر جانچنے اور پرکھنے کا بہترین وسیلہ "پنہاں کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ ہے" جس میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ہر ہر زاویے اور وسیلے سے نہ صرف پنہاں کی شاعری کے نئے گوشے دریافت کئے ہیں بلکہ جا بجا پنہاں کی شاعری کے نمونے اور حوالے دے کر اپنی رائے کو قطعیت ثابت کرنے کا طریقہ بھی کاریگری سے آزمایا ہے جس کے باعث زیرِ نظر کتاب تجزیاتی مطالعے کے ساتھ فنی عکس کا نمونہ بھی

ہوگی سے پیش کر رہی ہے۔ کتاب کی ضخامت ایک سو بیس صفحات پر محیط ہے اور قیمت دو صد روپے ہندوستانی مقرر کی گئی ہے۔ دستیابی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے:
نرالی دنیا پبلی کیشنز، ۷ زاہد ولی گیٹ، دریا گنج نئی دہلی بھارت۔

شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن تازہ دم تازہ رو اور تازہ کار صاحبِ قلم ہونے کے ساتھ ایسے علم پرور خانوادے کے چشم و چراغ ہیں جن کا صدیوں سے علمی اور ادبی روش پر چلتے رہنا بہت سے نئے چراغوں کو روشن کرنے اور پہلے سے جلتے چراغوں کو توانائی فراہم کرنے کا شاندار ریکارڈ ہے۔ آپ کے والد محترم اردو شاعری کے علاوہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ نوازی میں اہم مقام و مرتبے کے حامل ہونے کے باعث اہلِ علم میں بہت ہی احترام کے مقام پر متمکن ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات" جناب محمد آصف وٹو کے تجسس و اشتیاق کا ثمر ہے جس میں موصوف نے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن پر مرتب اور تحریر کی گئی اس کتاب کو اس قدر تفصیل اور توجہ سے ترتیب و تہذیب کیا ہے کہ پڑھنے والے پر معلومات کے خزانے وا ہونے لگتے ہیں۔ بظاہر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک پرشوق نوجوان قلم کار کے طور پر جانے جاتے ہیں مگر اُن کے علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کام کی تفصیل جاننے کے بعد ان کی نسبت ایک بردبار، سنجیدہ، صاحبِ علم اور صاحبِ عمل محقق اور نقاد کا گمان ہونے لگتا ہے جسے یقین میں نہ بدلنے کی قطعاً گنجائش نہیں رہتی۔ جناب آصف وٹو نے "شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات" کو چار ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ باب اول ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے جسے پڑھ کر قاری کا سانس پھولنے لگتا ہے کہ اس قدر کم عمری اور کم وقت میں کوئی شخص کیونکر اتنے ڈھیر سارے علمی و ادبی کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ زیرِ نظر باب میں پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے جید و نامور اہلِ قلم کا تحریری و تقریری خراجِ تحسین ہماری رائے کو تقویت بخش رہا ہے۔ باب دوم میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تحقیقی و تنقیدی سفر پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے کارناموں کو بیان و تحریر کیا گیا ہے۔ باب سوم میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی زاویے زیرِ بحث لا کر ان کی تنقیدی تہذیب کو اُجاگر کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ باب چہارم کا عنوان ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا اختصاص ہے جس میں فاضل مصنف نے تفصیل سے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ہم عصروں اور ماضی، حال اور مستقبل کے نقاد اور تخلیق کاروں کی نسبت اُن کی تنقیدی بصیرت کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جس میں اُن کی کامیابی مسلم ہے۔ درج بالا تحریر کی اصابت کے لئے اپنے عصر کے نامور ادیب، محقق، نقاد ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی رائے اعتراف درج کی جا رہی ہے۔

"ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت کئی جہات کی حامل ہے۔ معلم، محقق، نقاد لیکن اس کے ساتھ نفیس طبیعت انسان اور لطیف مزاج ادیب بھی ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی کام کے مترادف ہے تبھی انہوں نے متنوع مصروفیات کے باوجود تحقیقی و تنقیدی ڈھیر ساری کتابیں تحریر کر ڈالیں۔ یقیناً ان کے قبضے میں کوئی جن ہے یا وہ خود ایک ایسے جن ہیں جو بوتل میں بند ہونے کے لئے قطعی تیار نہیں۔"

"سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات" دو صد چالیس صفحات پر مشتمل ہے جسے نہ صرف ہنرمندی سے تحریر و ترتیب اور تزئین کیا گیا ہے بلکہ طباعت میں بھی کتاب کا حسن روایتی انفرادیت کا حامل ہے اور قیمت انتہائی مناسب فقط دو صد روپیہ ہے جو مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کی جا سکتی ہے:
اظہار سنز، ۱۹ اردو بازار لاہور فون 042-7230150

آزاد غزل کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

"آزاد غزل کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" ڈاکٹر ملک سجاد بخاری کے ایم فل کا مقالہ ہے جسے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول غزل کی روایتی ہیئت اور فنی خصوصیات، دوم آزاد غزل کے تصور کی ابتداء، چھان بین، سوم آزاد غزل کے ارتقا کی تفصیل، چہارم آزاد غزل کے حق اور مخالفت میں دی گئی آرا جس میں مقالہ نگار کی حتمی رائے بھی شامل ہے۔ بخاری صاحب کے بقول آزاد غزل کی اصطلاح سب سے پہلے 1962ء میں وجود میں آئی اور 1968ء میں اس کا باقاعدہ رواج شروع ہوا۔ گذشتہ پینتیس برسوں میں آزاد غزل کے حق اور مخالفت میں اتنا کچھ تحریر کیا گیا ہے کہ اس صنف نے کچھ نہ کچھ استحکام ضرور حاصل کر لیا ہے۔ اس دوران آزاد غزل کے سرمائے میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ اسی باعث بخاری صاحب اس موضوع کو اپنے مقالے کے لئے منتخب کرنے پر مجبور ہوئے۔

ڈاکٹر سجاد بخاری صاحب نے اپنے مقالے میں غزل کی تاریخ، غزل کا ارتقا، غزل کی ہیئت، غزل کی زمین، اوزان و بحور، غزل کی تقطیع، مطلع، مقطع، غزل کی فنی خصوصیات، تغزل، ایجاز و اختصار، غزل میں روایتی ہیئت کی حدود کی پابندی کے نتائج، وزن کی پابندی کی اہمیت اور نتائج، قافیہ ردیف کی پابندی کی اہمیت اور نتائج، تخیل کی جدت سے مضامین کا تنوع، غزل کے مخصوص تلازمے اور ان سے انحراف کی صورتیں، تغزل، آزاد غزل کا بنیادی فرق، پہلا آزاد غزل گو، آزاد غزل کا مفہوم، ناقدین کی نظر میں آزاد غزل، آزاد غزل کا فنی جائزہ، آزاد غزل کے فنکاروں کا تنوع جیسے اہم اور وسیع موضوعات پر صراحت کے ساتھ تحقیق، جستجو اور صحت مند گفتگو کے ساتھ نہ صرف اس موضوع کو اہلِ علم کی خدمت میں پیش کیا ہے بلکہ ادب سے وابستہ نوجوان، نو آموز اور سینئر تخلیق کاروں کو آزاد غزل کی اہمیت، انفرادیت اور ضرورت سے بھی کما حقہ آگہی دی ہے۔ آپ جب بھی غزل اور آزاد غزل کے موضوع کو اپنی بحث کا عنوان بنانا چاہیں گے اور اپنی جستجو اور اشتیاق کو مہمیز دینے کے آرزومند ہوں گے اس وقت

آپ کو لازمی طور پر ڈاکٹر فلیس سجاد بخاری صاحب کی کاوش "آزاد غزل کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" کی طلب بھی بہر حال میں ہوگی۔ کتاب کی ضخامت ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل اور قیمت ایک سو پچاس روپے ہندوستانی جب کہ ملنے کا پتہ عزالی دنیا پبلی کیشنز' بازار دلی گیٹ' دریا گنج' دہلی' بھارت ہے۔

آنچل میں اُداسی

لائی ہوں چراغ اپنا ہواؤں کے مقابل
جیسے کوئی سورج ہو گھٹاؤں کے مقابل
گونجا ہے پھر اِک نغمہ سر بزم تمنا
اُبھری ہے اِک آواز صداؤں کے مقابل

یہ اشعار حمیرا راحت کے شاعرانہ محاسن و کمالات کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں اور اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کی شاعری مفروضات سے نہیں حقائق سے تعلق رکھتی ہے' ایسے حقائق جو انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہیں اور اپنی اسی خوبی کے سبب قارئین سے بھرپور داد و تحسین وصول کرتے ہیں.....ڈاکٹر فرمان فتح پوری

محدود کیوں رہوں میں تری کائنات میں
عالم کچھ اور بھی ہیں ابھی ممکنات میں

حمیرا راحت کے تازہ شعری مجموعے "آنچل میں اُداسی" میں جو جہانِ معنی نظر آتا ہے وہ ایسا نہیں کہ چند جملوں اور ایک آدھ مضمون میں اس کا جائزہ پیش کیا جاسکے۔ یہ شاعری عطیۂ غیبی ہے جو شعوری کاوشوں سے مستغنی ہوا کرتا ہے.....پروفیسر آفاق صدیقی

دوڑتی بھاگتی/ زندگی میں کبھی/ تم اگر مل گئے/ تم سے پوچھیں گے یا
کس طرح بجھ گیا/ چاہتوں کا دیا/ جذبۂ دل میں سچائی کی کمی کی/ یا دیے میں ہواؤں سے لڑنے کی/ طاقت نہ تھی

حمیرا راحت کی شاعری میں تجربات کے ساتھ عصری آگہی موجود ہے۔ انہیں میں نئے امکانات کی ایسی شاعرہ سمجھتا ہوں جس سے مستقبل میں بہت اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں...... محسن بھوپالی

اب کوئی دُکھ ہے نہ آنسو ہیں نہ احساسِ زیاں
آج کل کشتی میں تنہا ہوں تجھے کیا معلوم

حمیرا راحت کی شاعری میں موجود خلوص و جود اپنی رفاقتوں' محبتوں اور دلی وابستگیوں کے حوالے سے زندگی کے سفر میں درپیش حسن و قبیح و فراز کی کہانی سنا رہے ہیں وہ ایک ذاتی سچائی بھی ہے اور اجتماعی صداقت بھی......
شاہدہ حسن

ستاروں سا مقدر مانگتی ہوں
میں آئینے سے پتھر مانگتی ہوں

حمیرا راحت کی شاعری اپنی ذات کے گرد طواف نہیں کرتی بلکہ اپنے ماحول کی مٹی کی خوشبو ساتھ لے کر حیات و کائنات کے آنسوؤں میں دور تک جھانکنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے.....احمد ندیم قاسمی

پبلشرز: کیوس کیونی کیشن' رنگل ٹریڈ سکوائر' رنگل چوک' صدر' کراچی۔

عصری تحریریں

"عصری تحریریں" نامور افسانہ نگار جناب دیپک بدکی کے تحریر کردہ تبصروں اور تنقید پر مشتمل ہے۔ جس میں عرضِ ناشر کے تحت جناب شبیر احمد کے رشحاتِ قلم' ابتدائیہ کے عنوان سے فرید پرتی صاحب کی خیال افروز تحریر اور حرفِ اوّل کے طور پر جناب دیپک بدکی کی خود آگہی سے ہر بار یا نصیب ہوتی ہے۔

"یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے تبصرہ نگاری میں قدم رکھا۔ ہوا یوں کہ ماہنامہ انشا کولکتہ کے مدیر جناب ف۔س اعجاز نے اپنی تصنیف "صاحب فن" پر میری رائے جاننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ رائے قلم بند کرنے کے لئے کتاب کا پڑھنا سمجھنا اور اس کے بعد اپنے تاثرات تحریر کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد احباب کی جانب سے کتابوں کی ترسیل کی شکل میں ایک سیلاب سا آگیا۔ دفتری مصروفیات کے باوجود میں نے اپنے تاثرات قلم بند کرتے وقت تحمل سے کبھی کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحریروں میں بیشتر عام تبصروں کی سطحیت اور اختصار ہے اور نہ ہی تنقیدی مضامین جیسی گہرائی اور طوالت۔ یہ تاثراتی تبصرے کسی مخصوص مکتب فکر کی دین نہیں اور نہ ہی ان میں اعتقادی مباحث کا دعویٰ کیا گیا ہے.....دیپک بدکی

آپ نے ابھی جناب دیپک بدکی کے حرفِ اوّل سے مختصر اقتباس ملاحظہ فرمایا۔ اب آپ کی توجہ کے لئے اُن محترم اہلِ قلم کے اسمائے گرامی درج کئے جا رہے ہیں جن کی نسبت جناب دیپک بدکی نے یہ پل صراط عبور کیا ہے۔ جناب مالک رام کے حوالے سے پانچ مضامین اور نقوشِ حیات کے عنوان سے اُن کے حالات زندگی' افسانے کے حوالے سے جناب گلزار' جناب وریندر پٹواری' جناب رتن سنگھ کے فن و شخصیت کو کسوٹی پر جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ نثر کے باب میں جناب انیس رفیع' جناب نور شاہ' جناب دیپک کنول' محترمہ ترنم ریاض' جناب ایل گلکر' جناب نعیم کوثر' جناب معین الدین عثمانی' جناب شاہد اختر' جناب ایم مبین' جناب آر۔ایس ٹی شرما' جناب اقبال حسن آزاد' محترمہ کمیرا حیدر' ڈاکٹر نور احمد انصاری' جناب مجید احمد آزاد' جناب رشید الدین' ڈاکٹر مہر گوہر علی خان اور زہرہ محمود صاحبہ کے نام اہم ہیں۔ باب شاعری میں عالم خورشید صاحب' ف۔س اعجاز صاحب' ڈاکٹر فرید پرتی صاحب' سیدہ نسرین نقاش صاحبہ' رفیق راز صاحب کی شخصیت اور اُن کا فن زیر بحث لایا گیا ہے۔ گوشہ صلاح الدین نیّر میں نیّر صاحب کے رشحاتِ قلم کے علاوہ جناب معصوم

انصاری، ڈاکٹر حنیف ترین، جناب اسد شفائی، جناب عدم کاشمیری، جناب شجاع الدین شاہد، جناب طاہر عظیم، جناب آفتاب حسن تمر اور سلطانہ مہر صاحب جلوہ فروز ہیں۔ باب تنقید میں جناب مظہر امام، جناب ابراہیم اشک، ڈاکٹر انور ظہیر، ڈاکٹر غلام حسین، ڈاکٹر انوار احمد انصاری، سید خالد محمود، جناب خلیق انجم اور ملک نصرت، نذیر فتح پوری صاحب، جناب بخے گوڈبولے، جناب محمد حسن رضوی اور کے ایل نارنگ ساقی کو ان کی نگارشات کے وسیلے سے بروئے کار لایا گیا ہے۔ کتاب کی ضخامت دو سو اٹھہتر صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت دو صد پچاس روپے اور دستیابی کا پتہ: میزان پبلی شرز، الناصل، برکتہ ہیڈ کوارٹر، بالا، سرینگر، کشمیر 190001، بھارت۔

پری خانے کا مسافر

قیام پاکستان کی شکل میں برصغیر کے کروڑوں لوگوں کی اپنی شناخت اور آزادانہ طرز زندگی کا موقع میسر آیا مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دوہری ہجرت کے باعث مسلسل دربدری کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ جناب جمیل عثمان کا شمار انہیں طرح کے لوگوں میں ہوتا ہے جو تقسیم ہندوستان سے مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) پھر موجودہ پاکستان اور اس کے بعد سعودی عرب اور اب امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ ان کے اندر کی آگ ان کی بے چینی اور بے قراری کو کسی نہ کسی شکل میں دہکائے ہوئے ہے جس کی ایک شکل ہمارے روبرو "پری خانے کا مسافر" کے روپ میں موجود ہے۔ "پری خانے کا مسافر" جناب جمیل عثمان کے مشاہدات و تاثرات کا ایسا مجموعہ ہے جس میں مزاح کی چاشنی، طنز کی کاٹ اور علم کی تہہ در تہہ پرتیں موجود ہیں۔ وطن عزیز سے بے شمار لوگ باہر جاتے ہیں اور گاڑھے پسینے کی کمائی زرمبادلہ کی شکل میں وطن ارسال کرتے ہیں جس کی وجہ سے وطن میں خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے مگر ان کی اپنی زندگی بے شمار صعوبتوں، پریشانیوں اور جدائی کے غم سے تعبیر ہوا کرتی ہیں۔ یہ تحریر مضامین ایسے ہی محنت کشوں کے شب و روز سے عبارت ہیں ان میں ہر کردار کی اپنی نفسیات ہے اپنی افتاد طبع ہے مقصود کسی کی ذات پر براہ راست نشانہ زنی نہیں بلکہ وہاں درپیش آنے والی تمام تر اچھائی اور برائی کو آشکار کرنا ہے جسے پڑھ کر قاری کو کبھی اپنا اور کبھی اپنے گردوپیش کا منظر دکھائی دینے لگتا ہے مگر پڑھنے والوں کی طبیعت بوجھل ہرگز نہیں ہوتی۔ ایک طرح کی بشاشت اور تازگی پڑھنے والے کا احاطہ کئے رکھتی ہے بقول ڈاکٹر انور سدید: "جمیل عثمان کی لطافت نگاری میں مجھے "صورت واقعہ" سب سے اہم نظر آتی ہے۔ پطرس بخاری کیا لعل کپور اور مشتاق یوسفی کی طرح مسکراہٹوں کی بھرپور فصل اگانے کے لئے وہ پہلے ایک کردار کا انتخاب کرتا ہے اور پھر اس کردار کی چند قاشوں سے ایسے واقعات منتخب کرتا ہے جو مجھے اور آپ کو بے ساختہ مسکراہٹوں سے سرفراز کرتے چلے جاتے ہیں۔"

اصحاب شکی کے اس دور میں اگر چند ساعتیں آپ کو اپنے گردوپیش سے بےخبر اور لاتعلق کر کے ہشاش بشاش کر سکتی ہیں تو یہ امر بعید از فہم نہ ہوگا اور اس جزو تنہائی کی قیمت فقط دو صد روپے پاکستانی، 20 امریکی ڈالر، 30 سعودی ریال اور 30 اماراتی درہم کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک جستجو زحمت اور مشقت زیر نظر کتاب کے پبلی شرز سے رابطے کی اطلاع کے لئے ذیل میں ان کا پتہ درج کیا جا رہا ہے عثمان گرافکس، 25 سی، پلازہ، حسرت موہانی روڈ، کراچی۔

ستارے میرے آنسو ہیں

"میں نے چند برس پہلے گلگتی بھون کے پہلے مجموعے "خوشبو کی تتلی ہے" کا دیباچہ ان الفاظ پر ختم کیا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ بلوچستان کے سنگلاخ چٹانوں میں کھلنے والے اس پھول کی خوشبو دنیائے ادب میں دور دور تک پھیل کر سب کو اپنا اسیر بنانے لگی۔ آج میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ گلگتی بھون برصغیر پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں نہ صرف پہچانا جاتا ہے بلکہ لائق توجہ بھی گردانا جاتا ہے..... محسن بھوپالی

آنکھیں چلی گئی ہیں نظارے کے ساتھ ساتھ
لیکن ہمارا ذوق نظر تو نہیں گیا

یہ گھر کی بات ہے گھر میں رہے تو بہتر ہے
زمیں کا فیصلہ کیوں آسماں پہ رکھا جائے

ایسے بھی کچھ چہرے ہیں اس دنیا میں
جو آنکھوں سے خواب چرانے آ جاتے ہیں

باغ کے اک کنج میں کھلتے ہوئے پھولوں کے بیچ
دوڑتے بچوں کو رنگین تتلیاں سمجھا تھا میں

جناب گلگتی بھون کے فن کی نسبت ملک کے نامور شاعر محترم محسن بھوپالی کے رشحات قلم کے ہمراہ انہی کے پسندیدہ اشعار "ستارے میرے آنسو ہیں" سے نقل کرنے کے بعد کسی قسم کی حاشیہ آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں رہتی کیونکہ بسا اوقات مختصر اور برمحل چند موزوں اور مناسب جملوں کے مقابلے طویل کلام نہ صرف گراں گزرتی ہے بلکہ کبھی بے جا مداحت بھی تصور کی جاتی ہے چنانچہ ہماری خواہش قطعاً آپ کے روبرو اس عمل کے مرتکب ہونے کی نہیں ہے البتہ جناب گلگتی بھون کے کلام سے اپنی پسند کی مختصر نظم "مکتی" آپ کی نذر کرنا ضرور چاہیں گے۔

اک بستی کے بچے پریاں اور دانا کی کتب پڑھتے جاتے تھے/ ان میں سے اک چودہ سالہ/ بھولی بھالی لڑکی نے/ پڑھنا جانا چھوڑ دیا ہے/ کیونکہ

اُس "سیپیا" میں اُ "سوتی" بجنے والا ہے۔

"ستارے میرے آنسو ہیں" ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت فقط ایک صد روپے اور دستیابی کا پتہ: دھنک پبلی کیشنز، مسجد روڈ سبّی، بلوچستان ہے۔

عالمی اردو ادب 2006

کرے دیا نہ پلی بھی مسمار مرے
باقی ہیں کچھ لوگ بھی اُس پار مرے

شعر کی صحت اور شاعر کے نام سے بے خبری کو ہماری کم علمی سے تعبیر کرتے ہوئے اُس جذبے اور جواز پر غور فرمایئے جس کو نمایاں اور ہویدا کرنے کے لئے درج بالا شعر تحریر کیا گیا ہے۔ وقت گذر رہا ہے پُر نور اور پُر شوق چہرے بھی وقت کی گردش میں گم ہو رہے ہیں مگر ابھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جن پر جس قدر بھی ناز، فخر اور غرور کیا جائے کم ہے۔ جی ہاں! ہماری مراد فرزند راولپنڈی اور خادم اردو جناب نند کشور وکرم سے ہے۔ موصوف جس قدر خاموشی اور لگن سے یک و تنہا اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت میں وقف ہیں اُس کے لئے دل سے دعا کے سوا کچھ نکل ہی نہیں سکتا۔ جس قدر تیزی اور شدت سے تعصب اور تنگ نظری کی آندھی اُمڈ رہی ہے، اُس میں محبت اور اپنائیت کا چراغ جلائے رکھنا کسی طرح بھی جہاد سے کم نہیں ہے۔ چند دیوانے اور سر پھرے اس پُر آشوب دور میں ایسے بھی ہیں جو ملک، قوم، مذہب اور طرح طرح کی قدغن سے بے پرواہ ہو کر محبت، امن، آشتی کا علم ابھی بھی اُٹھائے ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اُن سرپھروں کے سرخیل کا سہرا اگر جناب نند کشور وکرم کے سر باندھا جائے تو یہ فیصلہ ہر طرح سے درست، صائب اور حق بہ حق دار رسید کے مترادف ہوگا۔ جناب نند کشور وکرم پورا سال نہایت جانفشانی سے اردو زبان و ادب کا ذخیرۂ معلومات جمع کر کے اپنے چاہنے والوں کی خدمت میں پیش کر کے تحقیق و جستجو کو ربع صدی سے کارگزار رہے ہیں مگر جب کوئی عاشقِ اردو کوئی متوالۂ ادب فن کی توجہ کا مرکز بنتا ہے تو وہ "عالمی اردو ادب" کا پورا شمارہ اُس کی نظر کر کے ایک طرف اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں تو دوسری طرف ادب سے وابستہ احباب کی توجہ اُن کی بے بہری کی جانب دلاتے ہیں۔ جناب اشفاق احمد کی وفات اردو ادب کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے۔ اس خلا کو وقت پورا کر سکتا ہے نہ کوئی مرہم اس زخم کو مندمل کر سکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس ملک، قوم اور اہلِ قلم کے لئے محترم اشفاق احمد نے اپنی تمام تر توانائی بے دریغ لٹائی تھی وہ اُن کی وفات پر اُن کے شایانِ شان اُن کی حیات و کارناموں کو محفوظ کرنے کا جتن کرتا۔ مگر ہمیشہ کی مانند اس بار بھی ایسا نہیں ہوا اگر ہوا بھی تو سرحد پار کی جانب ہوا جہاں جناب نند کشور وکرم نے "عالمی اردو ادب" کا پورا شمارہ جناب اشفاق احمد کی شخصیت و فن کی معلومات سے منور کر کے ہمارے لئے ایک راہ کا تعین کر دیا۔ دیکھئے ہم میں سے کتنے لوگوں کا ضمیر انہیں جناب نند کشور وکرم کی دکھلائی ہوئی راہ پر چلنے کی مہمیز دیتا ہے۔

"عالمی اردو ادب" کی تین سو تیرہ صفحات کی مجلد اس خاص اشاعت میں جناب اشفاق احمد کی ایامِ شباب سے ایامِ پیری تک کے تصویری عکس کے علاوہ اُن سے کئے گئے انٹرویوز، مضامین، خراجِ عقیدت اور منظوم خراجِ عقیدت کے علاوہ اشفاق صاحب کے نمائندہ افسانے چھڑ کیا کسی کو پھر کسی کا کا تو؟ گڈریا، گھرا ئیاں اور گھر جاتے دارا شہر کنارے مضمون معہ زندگی ظلم میں چلنے کا سودا مضمون مرنے کے بعد کیا ہوگا پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان قدرت نے کس قدر نابغہ اور نادر شخصیات پیدا کیں مگر ہم نے اُن سے کما حقہ فیض حاصل کیا نہ اُن کو وہ مقام دیا جس کے وہ بجا اور برحق مستحق تھے۔ جناب نند کشور وکرم کا یہ کارِ تحسین اُسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب ہم براہِ راست اس محترم دستاویز کو اُن سے طلب کریں اور اپنے دور کے لیونگ لیجنڈ جناب اشفاق احمد کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنے کا ازالہ خراجِ عقیدت کی صورت میں پیش کر کے اُن کے علمی، ادبی اور روحانی فیضان سے خود بھی فیضیاب ہوں اور اپنے گرد و پیش کو بھی اس جانب راغب کریں۔ عالمی اردو ادب کی یہ خاص سوغات ادب F-14/21-D، کرشن نگر دہلی سے 250 روپے ہندوستانی کے عوض حاصل کی جا سکتی ہے۔ فون 0092-11-22094419

جواب آں نظم

ڈاکٹر صابر آفاقی

(۱)

ندا صاحب
خدا خاموش کب ہے؟
ندا دیتا رہا پہلے
ندا دیتا ہے وہ اب بھی
صدا دیتا ہے وہ اب بھی
خدا خاموش کب ہے:
خدا تو بولتا ہے، پر
ہمارے کان بہرے ہیں
کہ آوازیں نہیں سنتے
یہ ہم ہیں جو
یہاں خاموش رہتے ہیں
یہ ہم ہیں جو
سدا مدہوش رہتے ہیں
جو سب نغموں کا، حرفوں کا،
جو سب لفظوں کا خالق ہے
اسے خاموش کہتے ہو؟
سبھی نغمے اسی کے ہیں
زبانیں ساری اس کی ہیں
بنوں میں ساری مہکاریں بھی چہکاریں اس کی ہیں
اسے خاموش کہتے ہو؛

(۲)

خدا کے کام تھے جتنے
وہ اس نے کر دیئے سارے
کہ پھیلائی زمیں اس نے
درختوں کو اُگایا ہے
پہاڑوں کو قرینے سے لگایا ہے
فلک پر چاند ٹانکا ہے
ستارے جڑ دیئے اس نے
یہ سارے کر دیئے روشن
ہواؤں کو چلایا ہے
پرندوں کو عطا کی نغمگی اس نے
لبوں کو مسکراہٹ دی
"سڑک پر ڈولتی پرچھائیوں کو" زندگی دے دی
یہ سارے کام تھے اس کے
سو اس نے کر دیئے سارے

(۳)

بشر کے کام تھے جتنے
نہیں اک بھی ہوا اس سے
نہ نفرت دور کی اس نے
نہ محفل نور کی اس نے
نہ جنگوں کو مٹایا ہے
نہ فوجوں کو گھٹایا ہے
نہ سینے سے اچھوتوں کو لگایا ہے
نہ عورت کو حقوق اس نے دیئے اب تک
نہ مذہب کے تعصب کو مٹایا ہے
تعصب نے
بشر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے
ہر خطے میں رکھا ہے
نہ دہشت گردیوں میں کچھ کمی آئی
نہ جمہوری نظام آیا
نہ گردش میں وہ جام آیا

(۴)

ندا صاحب
خدا خاموش کب تھا؟
کبھی موسیٰ سے بولا وہ
کرشنا سے کبھی عیسیٰ سے بودھا سے
ہوا گویا
محمد کے لبوں پر پھول بن کر مسکرایا وہ
ہمارے عہد میں ناطق ہوا وہ
جمال اقدس الٰہی کے پیکر میں
خدا تو بولتا ہے، بات کرتا ہے
نئی باتیں بتاتا ہے
بشر کو وہ جگاتا ہے
نیا رستہ دکھاتا ہے
نئی دنیا بساتا ہے
نیا قانون لاتا ہے
نئے گلشن کھلاتا ہے
نئی شمعیں جلاتا ہے

(۵)

ندا صاحب
خدائے لم یزل کی تم نے گر آواز سننی ہو
نئی دہلی میں جو معبد بنا ہے نیلوفر جیسا
گہر جیسا
کسی دن جا کے بیٹھو معبد نیلوفری میں تم
کنول کے پھول میں وہ بولتا ہے
بات کرتا ہے
سبھی نغمے اسی کے ہیں
زبانیں ساری اس کی ہیں
اسے خاموش کہتے ہو؟
اسے خاموش مت کہنا

جناب ندا فاضلی کی نظم.... "خدا خاموش ہے" (چہارسو نومبر، دسمبر ۲۰۰۶ء) کے جواب میں۔

سخنِ آفتاب

بھول

امجد اسلام امجد

وہ عجب تھی شامِ وصال جو
کہیں راستے میں ہی کھو گئی
کوئی خواب تیرے خیال سے کسی رات ایسے اُلجھ گیا
کہ جو آنکھ تری منتظر
کہیں جاگتے میں ہی سو گئی

"یونہی دوستی کا بلا وجہ کبھی امتحاں نہ لیا کرو"
رہا جس پہ میں تجھے ٹوکتا
وہی بھول مجھ سے بھی ہو گئی

O

بیگنٹھ کی آگ

مناظر عاشق ہرگانوی

پرمتھیو اور اسپارٹا کس کو
مار ڈالا گیا
زندہ جلا دیا گیا آگ میں
وہ آگ جو چرا کر لائی گئی تھی
بیگنٹھ سے
مقدس گھر کے لئے
گھر...... جس کے پچھواڑے
کتے بھونکتے ہیں
بلیاں چیختی ہیں
اور انسانی سایے
وحشیانہ رقص کرتے ہیں
چاندنی رات میں
مہتاب کا تماشہ کیا جاتا ہے
دن کے اجالے میں
دوڑتی ہے ہوا
بھاگتی ہے روشنی
دھوپ اور دھول کی لہلہاہٹ
دھوئیں کے بیچ
پرمتھیو اور اسپارٹاکس کو ڈھونڈنا
پسینے کے نمک کا مزہ!

O

دردآشنا

یُونس صابرؔ

پارسی، سکھ ہو بہائی ہو وہ ہندو یا کرستان بھی ہو
یہ ضروری تو نہیں نام و نسب سے وہ مسلمان بھی ہو
ایسے ہیرو کی پرستش بھی بجا ہے جو دُکھی دُنیا میں
نیک ایدھی کی طرح، مدرٹریضہ سا وہ انسان بھی ہو

O

رباعیات　نامی انصاری

خورشید اُنا جانبِ مغرب سرکا
اعجازِ سخن کب سے ہے بے نام و پتا
اک نشہ ادب کا ہے کہ چڑھتا ہی نہیں
یہ بھی جو نہ ہو کیسے کٹے صبح و مسا

تاریخ کے اوراق ہیں کالے خاموش
ایثار و مروّت کے حوالے خاموش
کچھ پاس نہیں ناحق حسرت کے سوا
انعامِ وفا دینے والے خاموش

آلام کو تجسیم کیا ہے کس نے
تہذیب کو دو نیم کیا ہے کس نے
مذہب نے سیاست کی ڈگر اپنا لی
انسان کو تقسیم کیا ہے کس نے

تعبیرِ وفا کر کے نبھائیں گے کہاں
دنیا ہے اسی آنکھ میں، جائیں گے کہاں
گھر میں کوئی آنگن ہے نہ کمرہ ہے نہ چھت
دیوار گری تو سر چھپائیں گے کہاں

خورشیدِ طرب آنکھ ملائے تو کہوں
عرفانِ جنوں راہ سُجھائے تو کہوں
میں کون ہوں، کس حال میں ہوں، کیسا ہوں
آئینہ مرے سامنے آئے تو کہوں

تحریرِ ہلال نقش ہو گئی ہے دل پر
رفتارِ غزال نقش ہو گئی ہے دل پر
ہونٹوں کا فسانہ، گلِ نورس کا فسوں
تصویرِ جمال نقش ہو گئی ہے دل پر

کتابِ زندگی

ریٹا فلپس (Reta Phillips) کے نام

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہؔ کیلی فورنیا، یو ایس اے

کتابِ زندگی اے دوست، تیرے دل پہ لکھ آئے
ہمارے پاس کیا باقی ہے، جو تم کو لکھا جائے

جو کچھ تھیں دھڑکنیں دل میں، سب تیرے نام لکھ آئے
اب اس کے بعد کیا تم سے، حسابِ جاں کیا جائے

بہارِ عمرِ رفتہ تیرے دروازے پہ چھوڑ آئے
مگر یادوں کا بحرِ بیکراں، آنکھوں میں بھر لائے

اگر کہتے تو رُک جاتے، ہمیں تھی کون سی عُجلت
بسرِ اوقات کی خاطر، تیری صورت اٹھا لائے

نگاہوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے یوں تیری مُورت
اب ہم آئینہ دیکھیں، تیری صورت نظر آئے

ملاقاتوں کا ہر منظر، لپٹ کر رہ گیا دل سے
کبھی ہم دل کو سمجھائیں، کبھی دل ہم کو سمجھائے

بجا تم نے کہا، کہ تھا تعاقب میں تمہارا دل
تمہاری انجمن سے ہم پیاسی شام بھر لائے

کسی دم چھیڑ جاتا ہے، خیالِ یار جب تشنہ
اِن آنکھوں سے دفعتاً لبریز پیالے چھلک آئے

اک خوابِ پریشاں

پروفیسر خیال آفاقی

یکا یک چونک کر اٹھا جو میں اک خواب برہم سے
شب آخر تھا میرا واسطہ جیسے شبِ غم سے

ہوا محسوس جیسے چاند بھی سہما ہوا سا ہے
ستاروں کو بھی دیکھا تو لگے یکبار مدھم سے

عرق آلود تھا میں خواب وحشتناک سے اُس دم
کبھی گذرا نہ تھا ایسے کسی پُر ہول عالم سے

ہزاروں سرکٹوں نے ایک مجھ کو گھیر رکھا تھا
بھرے تھے ان کے دونوں ہاتھ اک بدرنگ مرہم سے

وہ زخمی جان کر مجھ کو مری جانب لپکتے تھے
نکل جاتی تھی میری جان ان بھوتوں کے اُودھم سے

میں کہتا تھا "نہیں ہوں زخم خوردہ چھوڑ دو مجھ کو"
مگر مطلب نہ تھا ان کو مرے انکار پیہم سے

کھرچ کر ناخنوں سے اپنے زخمی کر دیا مجھ کو
پھر اس کے بعد مجھ کو لیپ ڈالا گندے مرہم سے

میں حیراں تھا کہ یہ بے سر کے بھتنے کون ہیں آخر
کبھی گذرے نہ ہوں گے یہ کسی کی چشمِ عالم سے

ابھی کر ہی رہا تھا میں کہ اک بھتنا بڑھا آگے
دھاکا کر دیا اس نے اڑا ڈالا مجھے بم سے

کھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ میں زندہ سلامت ہوں
مگر نکلا نہیں تھا خواب کے مکروہ عالم سے

اسی دم وا ہوا دروازہ میرے بند کمرے کا
میرے پہلو میں جیسے آن بیٹھی نور اک چھم سے

تبھی حیران ہو کے میں نے پوچھا "کون ہو بی بی؟"
تعجب ہے وہ بولی "بے خبر ہو اپنی محرم سے"

تمہاری شاعری ہوں میں تمہاری خوش گمانی ہوں
کہ شعلہ زار کرتی ہوں دلوں کو دیدۂ نم سے

ابھی جو خواب میں دیکھے ہیں جتنے سرکٹے تم نے
وہ سب سرکردہ لیڈر ہیں جو "ڈال" ہیں قوم کے غم سے

انہی میں شعر و دانش کے کچھ ایسے ناخدا بھی ہیں
دلی ہمدردی رکھتے ہیں جو پوری نسلِ آدم سے

دکھی انسانیت کے یہ مسیحا، قول کے غازی
بزعمِ خود انہیں نسبت ہے طرزِ ابنِ مریم سے

رہی میں، تو مجھے لت کہو یا شاعری سمجھو
چھپاؤں کیا بھلا میں آپ جیسے اپنے ہمدم سے

یہ لیڈر اور یہ شاعر کہ ان کو کیا کہوں آخر
خدا شاہد ہے، میں عاجز ہوں ان کے ظلمِ پیہم سے"

یہ کہہ کر رو پڑی وہ اور نادم ہو گیا میں بھی
کہ وابستہ ہوں میں بھی شاعری کے پیچ اور خم سے

مسلّم ہے کہ میں بھی اس گروہ یاوہ گو سے ہوں
ہے کوئی کار بے مقصد تو وہ منسوب ہے ہم سے

دل ہی دل میں تھا سینہ کوب از راہِ پشیمانی
کہ اک دنیا مہک اٹھی صدائے اسمِ اعظم سے

فسوں پوری ہوئی کہ حور نے رختِ سفر باندھا
مجھے بھی کچھ سکوں حاصل ہوا اس نوری سرگم سے

چلا میں جانبِ مسجد تو دیکھا صحنِ گلشن میں
بہارِ صبح نغمہ گا رہی تھی گل کے شبنم سے

میرے دل نے بھی اس کا ہمنوا ہونے کی خواہش کی
تو وہ بولی "مجھے مطلب نہیں قوالِ اعظم سے

نہیں تابِ شنیدن اب کسی فرسودہ گوئی کی
بلا مرگ و زیاں حاصل ہے کیا اس شورِ ماتم سے

میں عاجز ہوں تری ان بے تکی باتوں سے اے شاعر
تری بزمِ خیالی سے، تری رزمِ توہم سے

نہ بجلی کی چمک تجھ میں، نہ دانائی کی کمک تجھ میں
نگینہ اشک کا گم ہو گیا ہے چشمِ حاتم سے

مرے ذوقِ سماعت کو نہ کر مجروح رہنے دے
مری بزمِ سخن آباد ہے اقبال کے دم سے"

o

باوضواوراق

باجوڑ کے مدرسے پر بمباری میں جاں بحق ہونے والے طلبا کی نذر

دِل نُواز دِلؔ

مدرسوں پر باخبر دُنیا کی وہ بمبارڈمنٹ
کٹ گریں خوش کُن طنابیں، پُول تھے پُھر اور نہ ٹینٹ

آج کی مُلکی سیاست خشک و تر کا امتزاج
موج میں ٹھٹکے کریں بہتی ندی سے احتجاج

ہو گئے قرآن کی صورت میں کتنے ہی شہید
باوضو اوراق تھے جو، اب وہ سب ہیں مُر بُریدہ

جا گرے نقد و نظر کے آبگینے دُور دُور
ہو گئے سب آئینے بے آب ہو کر چُور چُور

بے حسی کی اَب نہ حد ہے اور نہ ہے کوئی حدود
اِس دَنی دُنیا کی حرکت پر ہوئے جم کر جمود

یہ زمانے بھر کے دہشت گرد وحشت ناک دیکھ
لکھ رہے ہیں آج ظلمت کے قلم سے کل کا لیکھ

زندگی ان کے لئے ہے اب زمانے بھر کی موت
ان کی آنکھوں میں جگائے موت کی تُم دُوت بُھوت

ظالموں کے خواب میں دہشت گری کا ہے خیال
کُل جہاں کے زَر کو اپنے باپ کا سمجھیں یہ مال

اِن کے لالچ کی کوئی حد ہے نہ ہے کوئی حساب
ایسے ملکوں کی تو ہونے کو ہے بند ایسی کتاب

کون دہشت گرد اور ہے انتہا کس کو پسند
فیصلہ اس بات کا بھی اب کریں یہ ملک چند

موت میں پنہاں ہے دیکھو اب مسلماں کی حیات
خودکشی میں ڈھونڈتا ہے اب یہ گُم راہ نجات

جو جوش دیتے تھے دُنیا کو محبت کا ہمیش
اب ہیں نفرت کی نظر میں وہ مسلماں پیش پیش

کل زمیں کی خاک اُڑائیں گے یہ دُنیا کے خبیس
تیل کے مسلم ذخائر پر ہے اب چشمِ حریص

جس تمدن اور جس تہذیب پر ہے اِن کو مان
روئے ہے اُن بے کفن لاشوں کو اب دُنیا کی جان

اصل جن کی ہو نہ کوئی اُن کا کوئی کیا اُصول
خاک حاصل خاک ہی ہے بے اُصولوں کا حصول

دہر کی دولت پہ قبضہ ان کا ہے دیرینہ خواب
گا ہے گا ہے خواب کی تعبیر کرتے ہیں سراب

ان سے اب تو دیکھئے شیطان مانگے ہے پناہ
جن پہ اِس مردود کی ہر وقت رہتی ہے نگاہ

ہیں تنزل میں ترقی یافتہ سب ملک آج
اِن کے دیدہ اور دل پر دیکھ ہے دہشت کا راج

اِن کی قربت اور دُوری میں ہے اک جیسا عذاب
ہے سوالِ بُعد میں مشرق و مغرب کا جواب!

اِن کے بارے میں نہ رہنا خُسنِ ظن میں آنکھ دیکھ
دل کو دُنیا کی بجائے اپنے من میں آنکھ دیکھ

تنہا تماپوری

میاں ہوش میں ہو!؟

زمیں پر ہو تم
یا خلاء میں کھڑے ہو
میاں ہوش میں ہو!!؟

زمیں جب ہنسے گی
ہنسی دُور تک زلزلہ جب بنے گی
خدا کی زمیں کو زباں جب ملے گی
کہاں اور کب تم نے کیا کیا، کیا تھا
بتانے لگے گی
یہ ہاتھ اور پاؤں، یہ کان اور آنکھیں
زمیں کی گواہی کو تفصیل دیں گے
تم اپنی صفائی میں کیا کہہ سکو گے؟
خدا کی عدالت سے کیسے بچو گے؟

زمیں پر ہو تم
یا خلاء میں کھڑے ہو
میاں ہوش میں ہو؟!!!

O

ایک منظر

دُور:

گگن کی اُس نگری میں
کالے بادل
شور مچاتے، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے
اور، چمن کے ویرانے میں
خودرَو پودے، پیلے بدن میں
سر کو چھپائے کانپ رہے تھے۔

ایسے میں یہ مَیں نے دیکھا:
سُرخ گلاب کا ننھا پودا
ویرانے سے جھانک رہا تھا
آس کی آنکھوں سے بادل کو تاک رہا تھا
بادل اپنی آنکھ مچولی بھول گئے تھے
اور چمن کے ویرانے میں
وَرشا گھنگھرو باندھ رہی تھی
خودرَو پودوں کی آنکھوں سے
آشا باہر جھانک رہی تھی

O

ماہیے

انوار فیروز

اک بار تو آ ماہی
برہا گنی میں
مت مجھ کو جلا ماہی
کب بادل برسے گا
دید کو دل میرا
کب تک ترسے گا

سن لے یہ دعا میری
کب سے سُونی ہے
بستی یہ بسا میری

پنچھی گاتا ہے
پی پی کر کے
تری یاد دلاتا ہے

کیا ہوئی خطا مجھ سے
تو مجھ کو بتا تو دے
کیوں تو ہے خفا مجھ سے

ڈبہ ظالم ریل کا
لے گیا راہی کو
دشمن اپنے میل کا

O

دوہے

کاوش پرتا پگڈھی

سورج نے اک اک کرن‘ اپنی کر دی صرف
پھر بھی کچھ پگھلی نہیں‘ ضدی کچی برف

دیپک نے ہنس کر کہا‘ مجھ سے ہے یہ دھوپ
تم نے دیکھا ہی کہاں‘ میرا اصلی روپ

بھیتر صورت اور کچھ‘ باہر صورت اور
صورت صورت دیکھ کر‘ صورت بدلیں ٹھور

کتنا دوشت ہو گیا‘ دھرتی کیا پریویش
آسمان پر لے چلیں‘ کیا ہم اپنا دیش

ذرے ذرے کا یہاں‘ کتنا پیارا روپ
امبر تکتا ہی رہا‘ دھرا پی گئی دھوپ

کرودھ نہ آتا کیوں سکھی‘ مدھر ملن کی رات
کہی نہ اس نے رات بھر‘ کہنے والی بات

تقویٰ جس کے پاس ہے‘ وہ ہے وہاں مہمان
آپ یہاں بنتے رہیں‘ سید شیخ پٹھان

من چاہی شادی ہوئی‘ دونوں ہیں خوش آج
داتا! دونوں دل کریں‘ اک دوجے پر راج

چین کہاں تقدیر میں‘ کہاں ملے گی چھاؤں
دوڑ رہا ہے شہر میں‘ کاوش ننگے پاؤں

علیم صبا نویدی

شریف زادہ

وہ ہر فضا میں چلا تو مہک مہک کے چلا
مگر وہ کیا تھا کسی پہ نہیں کھلا جوہر
کھلے تھے اس کی شرافت کے ہر طرف دفتر
سراپا محبت و نغمہ کے روپ میں تھا ڈھلا

تمام عمر اسے زندگی ہنساتی رہی
جلوسِ نور کی باہوں میں اس کا مسکن تھا
نشہ میں بھیگا ہوا جیسے اس کا آنگن تھا
مہکتی چاندنی ہونٹوں پہ جھلملاتی رہی

ضرور سازشِ احساس طاق تھا اس کا
لہو میں اس کے سفیدی کا دور دورہ تھا
وجود اس کا سمندر کا ایک چھوڑا تھا
عوامِ شہر میں اونچا مذاق تھا اس کا

ہنوز اس کے یہ کام تھے اجالوں میں
سمجھ رہے تھے اسے لوگ خوش خصالوں میں

O

ایک شاعر (شری اٹل بہاری واجپائی)

ماجد سرحدی

بہاری واجپائی جی کہ تم تو ایک شاعر ہو
اور اِک شاعر کو ہم اہلِ نظر بھی تو سمجھتے ہیں

اُسے حالات اور جذبات کا ادراک ہوتا ہے
محبت کے لئے شاعر کا سینہ چاک ہوتا ہے

اُسے معلوم ہے جنگ و جدل اچھا نہیں ہوتا
اسے معلوم ہے کہ امن سے کیا کیا نہیں ہوتا

اُسے ادراک ہے بارود دوزخ کی نشانی ہے
حقیقت ہے خدا کی ذات باقی سب کہانی ہے

ملے انسان کو گر حق جہاں میں پھول کھلتے ہیں
مسائل حل اگر ہو جائیں تو دامن بھی سلتے ہیں

چلو تصویرِ عالم میں نئے سے رنگ بھرتے ہیں
تجارت ہو کہ کشمیر سب پر بات کرتے ہیں

اگر ہیں نیتیں اچھی بہاریں خوب آئیں گی
وگرنہ گم شدہ رستوں کی جانب لوٹ جائیں گی

میرے مولا تو یہ صبر و تحمل دم بدم رکھنا
میرے مولا تو میری سوچ شاعر کا بھرم رکھنا

بہاری واجپائی جی کہ تم تو ایک شاعر ہو

یہ نظم بھارت کے سابق وزیر اعظم اور جنگ نہ ہونے دیں گے کے شاعر شری اٹل بہاری واجپائی کے دورہ پاکستان/لاہور کے وقت لکھی گئی تھی۔ مقدر اس خواب کو پورا فرمائے (آمین)

رب نواز مائل

سطریں

کیسی سطریں ہیں یہ
کیسی باتوں پہ ہیں
اور پھر جانے کب کی لکھی
بھی ہوئیں
ذہن اِس پر بھی خوں؟ مرتکز دیر سے
اور پیچیدگی؟ پھر زباں کی بھی تو
ایسی کچھ
لفظ اِک اِک معما سا گویا لگے
فہم جس کو جگہ کیا کوئی
خود میں دے

O

کسے تصویر دکھلائیں

کسے تصویر دکھلائیں
یہ اک پٹی
جو ویسے تو ہے بس اِک سادہ سی کی تو
مگر کس خال و خد کی یوں
بنی ہم سے
کہ جیسے اور ہی عالم کی ہو پیاری کوئی صورت
بہ صد آمیزۂ رنگ و تخیل بھی
بہ صد آمیزۂ تقصہ و کاوش بھی

O

رباعیات

حسیؔر نوری

سچا ہے بہت لفظ و بیاں کا رتبہ
اچھا ہے بہت اہلِ جہاں کا رتبہ
ہر چند اہم سارے ہیں رشتے ناتے
اپنوں میں بڑا سب سے ہے ماں کا رتبہ

گلشن میں کوئی پھول کہاں کھلتا ہے
ہر سمت میں وحشت کا پتہ ملتا ہے
ہو جاتی ہے دنیا کی فضا گرد آلود
دل ماں کا جو دکھتا ہے فلک ہلتا ہے

کیا جانے کوئی شمع جلے یا نہ جلے
چٹان سی یہ رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
تنہائی کا احساس مکمل ہو جائے
ملنے دو لرزتے ہوئے سایوں کے گلے

پھولوں نے بھی ہیرے کا جگر کاٹا ہے
اخلاص کے سودے میں بڑا گھاٹا ہے
ہم اکیلے کہاں جائیں گے یہ جنسِ گراں
احساس کے بازار میں سناٹا ہے

کیا ہوتی کبھی خود ملاقات مری
بدلی نہ کسی جیت میں یہ مات مری
دشمن نہیں میرا تو کوئی گرچہ حسیؔر
دشمن ہوں کسی کا تو وہ ہے ذات مری

O

خراجِ تحسین

(غالب کی برسی کی مناسبت سے کہے گئے)

شگفتہ نازلی

کبھی تو پہروں تم تکتے رہو خلاؤں میں
'تمھی کہو کہ بالآخر یہ جستجو کیا ہے'
کبھی پھر اپنی دُھن میں بولتے چلے جاؤ
'تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے!'

ہوتی رہی سوالوں کی بوچھار اس طرح
کہ پھر کسی جواب کے قابل نہیں رہا'
گرچہ زیادہ فون اور فیکس ہو نہیں سکے
'لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!'

اُن سے مکالمے کی کوئی رہ نہیں ملی
جبکہ ہمیں تو بات سے بھی بات چاہیئے
یُونہی نہیں بُلایا اُن کو ایگزی بشن پہ
'تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے!'

حصار ہیں خواہشوں کے' کچھ بھی تو کرنے نہیں دیتے
بہت کچھ پا بھی لیں لیکن لگے ارماں ہیں کم نکلے'
اسی تکمیل میں ہو گی بسر پھر بھی لگے گا یُوں
'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے!'

دُنیا میں سُخنور کئی آتے ہی رہے ہیں
غالب کے یہاں معنی کا نگر اور جہاں اور'
اس واسطے بَرجستہ یُوں مصرعہ ہُوا موزوں
'کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور!'

موسمِ گُل کی آمد آمد ہے

انور جاوید ہاشمی

پھر گُلِ نو بہار کھلتے ہیں
بدلا جاتا ہے کُہنہ کیلنڈر

سالِ نو کی نوید لے کر پھر
ایک سورج طلوع ہوتا ہے

چھ برس پہلے کے ہزاریے میں
چھ برس بعد آج کی ساعت

جیسی لکھی گئی تھی آئی ہے
جبر و تقدیر کی کشاکش میں

کتنے ہی لوگ ساتھ چھوڑ گئے
ہاتھ میں تھے جو ہاتھ چھوڑ گئے

کون جانے کہ نظم لکھتے ہوئے
دھڑکنیں تیز ہوں کہ رُک جائیں

شادیانہ بجے کہ نوحہ ہو
روز سورج طلوع ہوتا ہے

سال نو کی نوید لے کر پھر
بدلا جائے گا کہنہ کیلنڈر

O

''سالِ نو کی پہلی دُعا''

شاہد اقبال شاہد

اس سے پہلے کہ ''جوہر جاڑا'' (Nuclear Winter)
اپنا سرد اور سفاک ہاتھ ہم سب پر رکھ دے
اور ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لے
اور ہم ہیروشیما اور ناگاساکی کی طرح
آنِ واحد میں لقمۂ اجل بن جائیں
اور زندہ بچ جانے والے بھی
اپنے جسموں پر تھرمل زخم (Thermal Injury) لئے
سسک سسک کر مریں
اور آنے والی نسلیں بھی
بدہیت اور مسخ شدہ حالت میں جنم لے
اور نشانِ عبرت بن جائے
آؤ! سالِ نو پہ دُعا کریں کہ
سرحدوں کے اُس پار سے
جہاں اَب گولیوں کی آواز رُک چکی ہے
کوئی سرخ گلاب لئے
ہماری سمت آئے
اور ہم شاخِ زیتون لئے گھر سے نکلیں
آسمان فاختاؤں سے بھر جائے
اے خدا! کوئی معجزہ رونما ہو جائے
ایشیا میں اَمن کا گہوارہ بن جائے
سالِ نو پہ یہی دُعا ہے
کہ دعاؤں میں کچھ اثر آئے
زمیں پہ میری مدد کو
خدا اُتر آئے

O

ڈرامہ

"عطار کے لونڈے"

گلزار جاوید

سین نمبر 1

مقام: عقیل کے گھر کا ڈرائنگ روم پرانا فرنیچر بوسیدہ پردے سیل زدہ دیواریں اور سینٹر ٹیبل پر چائے کے ہمراہ بسکٹ کیک پیسٹری اور شامی کباب۔

کردار: عقیل اور عقیل کے چند مفت خورے دوست اور ایک پھٹیچر شاعر

شاعر: (شامی کباب منہ میں رکھتے ہوئے) بھئی واہ واہ سبحان اللہ کیا کہنے....
عقیل میاں! ہمارے دوستوں عزیزوں شاگردوں اور نیاز مندوں کی تعداد سے آپ بخوبی واقف ہیں۔

عقیل: (ناگواری سے) جی جی....!

شاعر: خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک سے ایک بڑھ کر صاحب حیثیت اور بلند مرتبے کے حامل ہیں.... مگر.... تواضع اور خاطر داری کا جو اعلیٰ ذوق قدرت نے آپ کو ودیعت کیا ہے (پیسٹری کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے) اُس کی مثال کہیں نہیں ملتی.... کیوں میاں کیا نام ہے آپ کا.... مبارک حسین....

مبارک حسین: (تیزی سے شامی کباب کی پلیٹ اپنی جانب سرکاتے ہوئے) واللہ آپ تو شاعری فرما رہے ہیں.... یہ بھی کوئی راز کی بات ہے جس طرح دوستوں کو عقیل میاں عزت بخشا کرتے ہیں کبھی کسی نے بخشی ہے....؟

شاعر: آہاہا.... واہ واہ.... کیا برمحل جملہ ہوا ہے....

کئی دوست ہم آواز: ارشاد.... ارشاد.... ارشاد....!

شاعر: عقیل میاں! توجہ فرمایئے....!

عقیل: (بیزاری سے) ارشاد....!

شاعر: حضرات.... توجہ چاہوں گا....!

کئی آوازیں: جی.... جی.... ارشاد....!

شاعر: عرض کیا ہے....! کباب کھا لے اور پی لے چائے

کئی آوازیں ایک ساتھ: آہاہا.... سبحان اللہ.... کیا کہنے.... کیا مصرعہ باندھا ہے....!

شاعر: کباب کھا لے اور پی لے چائے + ہائے.... ہائے.... ہائے

سارے دوست ہم آواز: کیا کہنے.... سبحان اللہ.... پھر پڑھئے....

شاعر: عرض کیا ہے....! کباب کھا لے اور پی لے چائے + ہائے.... ہائے.... ہائے

دلبر خان: اُستاد! مصرعہ کیا ہے.... محبوب کی چٹکی ہے چٹکی (سالم پیسٹری منہ میں رکھتے ہوئے) سارے بدن میں گدگدی ہونے لگی ہے....

شاعر: لاحول ولا قوۃ.... میاں....! داد دے رہے ہو یا گھاس کاٹ رہے ہو....! عقیل میاں ملاحظہ فرمایئے....! کہا....

عقیل: (درمیان سے شاعر کا جملہ کاٹتے ہوئے) واہ واہ سبحان اللہ اس طرح کا مصرعہ آپ ہی کہہ سکتے ہیں (چہرے پر ناگواری واضح نمایاں ہے)

شاعر: اہل ذوق.... داد.... اس طرح دیا کرتے ہیں.... (روئے سخن دلبر خان کی طرف کرتے ہوئے شاعر نے عقیل کو مخاطب کیا) عقیل میاں....! ایک تازہ شعر آپ کی نذر ہے.... ابھی ابھی ہوا ہے....!

کال بیل کی آواز پر عقیل میاں معذرت کر کے باہر جانے لگتے ہیں۔

سین نمبر 2

مقام: گھر کے باہر گلی کا منظر

کردار: عقیل، ڈاکیہ، پڑوسی اور مولوی صاحب

ڈاکیہ: لیجئے عقیل صاحب.... منہ میٹھا کرایئے.... خدا نے آپ کی سُن لی....!

پڑوسی: (چہکلاتے ہوئے) میاں....! اکیلے ہی اکیلے منہ میٹھا کرو گے یا ہمیں بھی سناؤ گے خوشخبری.... اللہ قسم.... اتنے گئے گذرے ہم بھی نہیں ہیں.... عقیل میاں کی خوشی پر پاؤ آدھا پاؤ مٹھائی تو ہم بھی کھلا ہی سکتے ہیں....

مولوی صاحب: (زور سے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے) کس خوشخبری کا ذکر ہو رہا ہے میاں.... ذرا ہمیں بھی تو بتلاؤ....؟ کوڑوں کے بعد سے منہ میٹھا کئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں....!

عقیل: اسلام علیکم مولوی صاحب....

مولوی صاحب: وعلیکم السلام.... مگر.... خالی خولی نہیں.... بھرا ہوا سلام ہونا چاہئے خوشخبری کے موقع پر....!

عقیل: لاؤ بھائی اب بتلا بھی دو خوشخبری کی بابت (ڈاکیہ کو مخاطب کرتے ہوئے)

ڈاکیہ: اتنی بڑی خوشخبری ہے پہلے مٹھائی کھلایئے پھر بتلاؤں گا.... سولہ گریڈ کی نوکری کا کال لیٹر لے کر آیا ہوں....

مولوی صاحب: ماشاللہ.... ماشاللہ.... بس عقیل میاں آج سے نماز پنجگانہ شروع کر دیجئے پھر دیکھئے پروردگار عالم کس طرح آپ کی راہیں کشادہ کرتا

ہے....

عقیل: ماشاءاللہ' ماشاءاللہ.... لو میاں....فی الحال یہ رکھو نوکری ملنے کے بعد آپ کو مٹھائی میں تول دوں گا....(جیب سے ہاتھ نکال کر ڈاکیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے)

پڑوسی: بھیا ہمیں تو بس پیٹ بھر کھلا دینا....مٹھائی وٹھائی میں تلنے کا شوق نہیں ہوگا (ڈاکیہ اور مولانا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) انہیں تو سونے' چاندی میں تلنے کا شوق ہے....دیکھئے پروردگار کب سنتا ہے.... عقیل میاں آپ نے وہ مقولہ نہیں سنا....دینے والا جب دینے پر آتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے....!

سین نمبر 3

مقام: عقیل کے گھر کا دالان اور صحن کا منظر

کردار: عقیل کی والدہ' عقیل اور صحن میں کھیلتی ہوئی چھوٹی بہن

عقیل: امی....امی جی.... کہاں ہیں آپ....؟

عقیل کی والدہ: (کمرے سے برآمد ہوتے ہوئے) زور زور سے کیوں چیخ رہے ہو....دیوانے ہوگئے ہو کیا....؟

عقیل: امی جی.... آپ صرف دیوانے کی بات کر رہی ہیں میرا دل....دیوانہ' پاگل' مستانہ ہوجی ہوش چھوڑ گیو....نہ جانے کیا کیا بنے کو بیتاب ہو رہا ہے....!

عقیل کی والدہ: دماغ گھاس چرنے چلا گیا ہے جو اس طرح کی باتیں کرنے لگے ہو....!

عقیل کی چھوٹی بہن: (صحن میں رسی ناپتے ہوئے) لگتا ہے بھائی کو کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے....!

عقیل کی والدہ: چل ہٹ چھچھوری.... تجھے تو خواب میں بھی بھابی نظر آتی ہے....

چھوٹی بہن: مجھے....یا....!

عقیل کی والدہ: اچھا چھوڑو یہ بچپنا....اصل بات بتاؤ کیا ہے....؟

عقیل: یہ دیکھئے....!(والدہ کی جانب کال لیٹر لہراتے ہوئے)

عقیل کی والدہ: یہ کیا ہے....؟

عقیل: نوکری کا پروانہ....ایسی ویسی نہیں مینیجر افسری سولہ گریڈ کی نوکری' گھر' گاڑی' میڈیکل الاؤنس' میڈیکل تعلیم....تمام سہولتوں کے ساتھ....!

عقیل کی والدہ: پروردگار عالم تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے (آسمان کی جانب دونوں ہاتھ اٹھا کر) میں تو آج ہی شکرانے کے نوافل ادا کروں گی....

عقیل: امی جان....!جس قدر باقاعدگی سے آپ پانچ وقت کی فرضی نماز پڑھ کر خدا سے دعائیں مانگتی ہیں اس کے بعد نفل وغیرہ کی کیا ضرورت ہے....؟

عقیل کی والدہ: نا بیٹا نا....اس طرح نہیں کہتے....یہ تو میرے اوپر اپنے پروردگار کا قرض ہے....میں نے منت مانی تھی کہ جس روز میرے عقیل کو نوکری کا بلاوا آئے گا اس روز اور جس روز میرا بچہ ملازمت پر جائے گا اس روز سو سو نفل شکرانے کے ادا کروں گی....

عقیل: یہ آپ کا اور آپ کے پروردگار کا معاملہ ہے وہ جانے اور آپ جانیں.... فوری طور پر میرا سوٹ نکال دیجئے تا کہ میں اُسے ڈرائی کلین کرالاؤں....

عقیل کی والدہ: سوٹ....!کونسا سوٹ....؟

عقیل: آپ بھی کمال کرتی ہیں....اکلوتا گرم سوٹ تو ہے میرے پاس....!

عقیل کی والدہ: وہ.... کنگھی والا....!

عقیل: ہاں ہاں وہی کنگھی والا اور کونسا....؟

عقیل کی والدہ: تمہارا دماغ چل گیا ہے....!

عقیل: میرا دماغ چل گیا ہے..... کیوں.....؟

عقیل کی والدہ: ارے بدھو! پچھلے ہفتے ہی تم اپنے دوست محمود کے ہاں ڈرائی کلین کرنے کے لئے رکھ کر آئے تھے اپنا سوٹ اور میرا شال.....!

عقیل: ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ (سر کو ہاتھ مارتے ہوئے) واقعی میں پاگل ہوگیا ہوں.....!

سین نمبر 4

مقام: مین بازار میں ''پاک'' ڈرائی کلینرز کے نام سے محمود کی دکان

کردار: محمود کا چھوٹا بھائی محبوب' کارندہ رنگی اور عقیل

محبوب: آہا..... عید سے پہلے عید کا چاند کہاں چڑھ آیا.....؟

عقیل: تمہارا کیا خیال ہے' عید کے چاند کو نظر آنے یا نہ آنے کے لئے تمہاری اجازت کی ضرورت پڑتی ہے.....؟

محبوب: بہت دنوں بعد نظر آئے ہیں آپ..... اس لئے کہہ رہا ہوں.....!

عقیل: ابے یار.....!پچھلے ہفتے کوئی دو گھنٹے بیٹھا رہا ہوں..... تم نہ جانے کون سے کونے میں چھپے رہتے ہو.....پوچھو رنگی سے.....!

محبوب: مجھے علم نہیں..... میں کہاں جاؤں گا..... دکان..... گھر..... اور..... گھاٹ.....

عقیل: ورکشاپ کب جاتے ہو.....؟

محبوب: ورکشاپ.....!(حیران ہو کر سوچتے ہوئے) ہاں..... ہاں..... شام کو چکر لگاتا ہوں.....

عقیل: کہاں ہیں بھئی میرے سوٹ.....؟

رنگی: آپ کو تو علم ہے صاحب کہ حاتم طائی نے سات سوال حل کرنے کے بعد محمود بھائی کی بابت پوچھے گئے سوال پر ہار مان لی تھی.....!

عقیل: بہت بدمعاش ہوگیا ہے تو بیٹا.....!محمود نے سُن لیا تو وہ جوتے لگائے گا کہ نانی یاد آ جائے گی.....!

ثنی: آپ کس وقت کام آئیں گے.....؟
عقیل: چل چھوڑ باتیں نہ بنا میرا سوٹ دے دے.....
محبوب: آپ کا سوٹ..... میں نے تو نہیں دیکھا..... شوکیس میں دیکھ لیں..... اگر ہے تو میں نکال دیتا ہوں.....
عقیل: (شوکیس کو اچک اچک کر غور سے دیکھتے ہوئے) میرا خیال ہے اس میں تو نہیں ہے.....!
محبوب: بھائی آتے ہیں تو میں ان سے کہتا ہوں.....!
عقیل: کہنا نہیں ہے..... مجھے ہر حال میں کل اپنا سوٹ چاہئے وہ بھی ڈرائی کلین کیا ہوا.....!
محبوب: فکر ہی نہ کریں.....!

سین نمبر 5

مقام: یٰسین چائے والے کی دکان' چائے کی کیتلی' دودھ کا کڑاہو' لکڑی کی پرانی الماری کے ایک خانے میں چند ایک پرچ پیالے اور گلاس دوسرے خانہ میں بند مکھن' رس اور انڈے یٰسین کے قریب رکھا گلہ اور دکان کے باہر چند پرانی بنچیں
کردار: عقیل' یٰسین چائے والا' ایک میلا کچیلا ملازم اور دو گاہک

یٰسین: خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے.....!(اونچی آواز میں گنگناتے ہوئے)
عقیل: السلام علیکم یٰسین بھائی..... خیر ہے تو ہے آج بڑے اونچے سروں میں گا رہے ہیں.....؟
یٰسین: میاں! اونچے سروں میں گا ہی تو رہے ہیں رو تو نہیں رہے.....!
عقیل: مطلب.....؟
یٰسین: اتنے سادہ نہ بنو عقیل میاں..... ہم مٹھائی مانگنے والوں میں نہیں کھلانے والوں میں ہیں.....!
عقیل: اچھا تو آپ کو بھی پتہ چل ہی گیا.....!
یٰسین کا ملازم: لو جی یہ آپ کو بھی سے کیا مراد ہے آپ کی.....؟ عبدالحمید پوسٹ مین یٰسین بھائی سے ماہوری پہ چائے پی رہے ہے..... ان کو نہیں پتہ ہوگا تو کس کو ہوگا.....؟
عقیل: دعا کریں یٰسین بھائی اس بار اللہ تعالیٰ کامیابی نصیب کردے.....!
پہلا گاہک: میاں.....! یہ بے چارا تو ہر کسی کے لئے دعا کرے ہے مگر کوئی سننے والا بھی ہو.....!
دوسرا گاہک: لگتا ہے اللہ میاں بھی بڑے لوگوں کی سنتا ہے ورنہ بے چارے یٰسین کا لونڈا دو برس کر کے نوکریاں نہ جانے کتنا ٹکر رہا ہوتا.....!

یٰسین: میاں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے..... بس اپنے عقیل بھائی کو نوکر ہونے دو پھر دیکھنا اپنے شکوؤں کو کس طرح کام پہ لگاتے ہیں..... کیوں عقیل بھائی ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....!(بائیں آنکھ دباتے ہوئے)
عقیل: ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... کیوں نہیں.....!
یٰسین: لو اسی بات پہ ایک ملائی والی چائے ہو جائے.....!
عقیل: نہیں ابھی نہیں بہت بہت شکریہ..... میں ابھی ابھی محمود کی دکان سے چائے پی کر آرہا ہوں.....!
یٰسین: میاں رہنے بھی دو..... اس لپاڑیے کا نام نہ لیا کرو میرے سامنے.....!

سین نمبر 6

مقام: عقیل کا گھر اور پرانے کمرے میں بچھی مسہری' چند صندوق اور دو کرسیاں' کارنس پر سجے چینی اور تانبے کے برتن
کردار: عقیل' عقیل کی والدہ' عقیل کی ممانی یعنی ہونے والی ساس اور چھوٹی بہن

عقیل: السلام علیکم امی جان..... السلام علیکم ممانی جان..... کیسی ہیں آپ..... کب آئیں.....؟
عقیل کی ممانی: میں واری..... میں صدقے..... میں قربان..... رکتا سامنہ نکل آیا میرے بچے کا نوکری کی تلاش میں.....!
چھوٹی بہن: بھائی جان تو کل کہہ رہے تھے کہ ان کا وزن بڑھ گیا ہے.....؟
عقیل کی والدہ: چپ کر تجھی کہیں کی..... ہر وقت کتر کتر زبان چلتی رہتی ہے..... وقت دیکھتی ہے نہ موقع..... ہاں بیٹا.....!(عقیل کو مخاطب کرتے ہوئے) کپڑے سل گئے محمود کے ہاں سے.....؟
عقیل: نہیں امی..... محمود دکان پر نہیں تھا..... اس کے بھائی سے کہہ آیا ہوں..... صبح مل جائیں گے.....!
عقیل کی والدہ: اور ہاں بیٹا جب کپڑے لینے جاؤ تو یہ جھاڑ بھی کٹاتے آنا.....! (عقیل کے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
عقیل: کل تو شاید وقت نہ ملے میں ابھی کٹا آتا ہوں.....!(باہر جانے کے لئے مڑتا ہے)
ممانی: ٹھہرو بیٹا.....! ایک منٹ ٹھہرو.....!(سفید چوٹی برقعے کی بغل سے مٹھائی کا ڈبہ نکال کر کھولتی ہیں اور نوکری ملنے کی خوشی میں عقیل کے منہ میں لڈو ٹھونستے ہوئے دعائیں دینے لگتی ہیں) اللہ کامیاب کرے..... اور ہاں بیٹا سنو.....! میں نے امام ضامن بنوایا ہے تمہارے لئے صبیحہ نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے زم زم میں کریب کا کپڑا اڑ کر سیا ہے..... بس صبیحہ کے ابا آجائیں تو

میں اور وہ آ کر خود تمہارے بازو پہ باندھیں گے ..... انشاءاللہ اس بار کامیابی ضرور تمہارے قدم چومے گی.....!

سین نمبر 7

مقام: مین بازار میں "پاک" ڈرائی کلینرز کے نام سے محمود کی دکان

کردار: عقیل، محمود اور محمود کا ملازم زلفی

محمود: میری جان..... میرے بھائی..... میرے عزیز..... کہاں ہوتے ہو......؟

(عقیل سے معانقہ کرتے ہوئے محمود نے گرمجوشی کا مظاہرہ کیا)

عقیل: میں تو یہیں ہوتا ہوں.... تم سناؤ تم کہاں ہوتے ہو.......؟

محمود: میں نے کہاں جانا ہے.....ملا کی دوڑ مسجد تک..... گھر سے دکان اور دکان سے گھر (زلفی کھانسنے لگتا ہے)

عقیل: سنا ہے.....! اگلے الیکشن میں کھڑا ہونے کی تیاری کر رہے ہو (زلفی اور زور سے کھانسنے لگتا ہے)

محمود: یار مذاق مت کرو..... میں اور سیاست.....خدا کا نام لو.....خدا کا.....!

عقیل: اچھا.....ایسی بات ہے.....تو پھر کل کہاں تھے جناب.....؟ (زلفی منہ نیچے کر کے مسکرانے لگتا ہے)

محمود: کل.....اچھا.....وہ.....وہ.....میں.....اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا.....!

عقیل: مجیب تو کہہ رہا تھا.....؟

محمود: (چونکتے ہوئے) کیا کہہ رہا تھا مجیب.....؟ (زلفی کے ہاتھ سے استری پھسل جاتی ہے) استری تو.....ہاں تو عقیل بھائی..... مجیب کیا کہہ رہا تھا آپ سے.....؟

عقیل: ارے بھائی.....! مجیب نے مجھ سے کیا کہنا ہے.....میں البتہ اُس سے اپنے سوٹ کی بابت تاکید ضرور کر گیا تھا.....!

محمود: کون سے سوٹ کی بابت (بیگانگی سے)

عقیل: تم اتنے بھلکڑ ہو نہیں جتنا ظاہر کر رہے ہو.....لاؤ جلدی نکالو.....!

محمود: کیا نکالوں.....؟

عقیل: میرا سوٹ.....اور..... کیا.....؟

محمود: اچھا.....تو یہ کہو تمہارا سوٹ.....!

عقیل: آپ کے خیال میں.....اتنی دیر سے میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟

محمود: میرا خیال ہے تم بھی یہی کہہ رہے ہو شاید.....! (جھینپتے ہوئے)

عقیل: شاید نہیں بھائی.....یقینا.....یقینا اتنی دیر سے میں اپنے سوٹ کی بابت ہی بک بک کر رہا ہوں.....پتہ ہے کیوں.....؟

محمود: (بھولا سا منہ بنا کر) کیوں.....؟

عقیل: کیونکہ..... کیونکہ صبح مجھے.....بہت اہم انٹرویو پہ جانا ہے.....اور.....میرے پاس.....صرف ایک ہی سوٹ ہے.....!

محمود: (گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے) ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے..... پہلے چائے تو پی لو.....لو کر کے بیٹھو اتنی دیر سے عقیل بھائی کھڑے ہیں اور تو چائے تک لینے نہیں گیا.....! (محمود نے زلفی کو پھٹکارتے ہوئے چائے کے بہانے بھگا دیا)

عقیل: چائے وائے..... چھوڑو یار.....جلدی سے میرا سوٹ نکال دو (قدرے غصے سے)

محمود: (سراسیمگی کے لہجے میں) عقیل بھائی.....وہ.....بات یہ ہے.....کہ.....آپ کا سوٹ.....!

عقیل: ہاں.....میرا سوٹ.....؟

محمود: (گھبرا کر جلدی سے) جل گیا ہے.....!

عقیل: جل گیا ہے.....؟

محمود: جی.....جی.....جل گیا ہے.....!

عقیل: تم تو کہتے تھے کہ تمہاری ڈرائی کلیننگ کی ورکشاپ ہے اور اس میں ڈرائی کلیننگ کا امپورٹڈ پلانٹ لگا ہوا ہے.....؟

محمود: ٹھیک.....غلط..... تھوڑا کہا تھا بھائی.....! (قدرے ڈھٹائی کے ساتھ)

عقیل: میں کچھ نہیں جانتا.....مجھے ہر حال میں اپنا سوٹ ابھی چاہیئے.....!

محمود: ابھی.....!

عقیل: ہاں.....ہاں.....ابھی.....!

محمود: اس کا تو ایک ہی حل ہے.....!

عقیل: وہ کیا.....؟

محمود: یار.....فی الحال..... تم میرا سوٹ پہن کر کام چلا لو.....!

عقیل: تمہارا سوٹ.....(ہنسی ضبط کرتے ہوئے) میں نے تو زندگی بھر تمہیں سوٹ تو دور کی بات ہے پینٹ شرٹ پہنے ہوئے بھی نہیں دیکھا.....!

محمود: (بچہ سا منہ بنا کر) اب اتنا بھی بونگا نہیں ہوں.....پہنتا ہوں..... کبھی نہیں پہنتا.....شادی بیاہ کے موقع پر ضرور پہنتا ہوں.....!

عقیل: (یقین نہ کرتے ہوئے) پہنتے ہوں گے یار.....تمہارا سوٹ مجھے کب آئے گا.....؟

محمود: اب اتنا بھی موٹا نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو.....جتنا ڈھیلا ڈھالا لباس پہن کر جاؤ گے اتنے سوبر اور بردبار لگو گے.....اور جانتے ہو.....!

عقیل: اچھا بابا اچھا.....(عقیل نے محمود کا جملہ درمیان سے کاٹتے ہوئے)

جیسے تمہاری مرضی.....انٹرویو تو بہرحال مجھے دینا ہے.....!

سین نمبر 8

مقام: بڑے دفتر کی بلڈنگ کا ایک بڑا کمرہ جہاں بہت سے ملازم اور
کمرے کے باہر پی۔اے کی میز کرسی
کردار: عقیل و دیگر امیدوار ، آسامی اور صاحب کا پی۔اے

پی۔اے: بھائی.....!اس پر تو عقیل لکھا ہے.....!
عقیل: جی.....جی.....میں ہی.....عقیل ہوں.....!(خوشی سے سینہ پھلاتے ہوئے)
پی۔اے: کان کب سے صاف نہیں کروائے.....؟
عقیل: (پریشان ہوتے ہوئے) کیا فرمایا آپ نے.....؟
پی۔اے: میرے بھائی..... شکیل پکارا ہے میں نے..... شکیل..... سمجھے.....(جھلاہٹ سے عقیل کو کاغذات واپس کرتے ہوئے)
پی۔اے: ہاں بھئی..... شکیل ہے کوئی..... (خاموشی کے وقفے میں تمام امیدوار اشتیاق سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے) محمد رفیق.....(اس آواز پر ایک پرجوش نوجوان آگے بڑھ کر پی۔اے کو کاغذات دکھاتا اور اندر چلا جاتا ہے) جان محمد..... عمر سلطان..... محمد اسمٰعیل..... سکندر علی..... (تمام آوازوں پر خوش شکل اور پریشان حال نوجوان پرجوش انداز میں اندر جاتے اور مایوسانہ طریق پر باہر آتے رہے)
عقیل: .....جی.....(پی۔اے کی تیسری آواز پر حیرت، پریشانی اور شرمندگی کے انداز میں عقیل پی۔اے کے روبرو کاغذات پیش کرتا ہے)
پی۔اے: ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... میری چیکنگ تو بس رہی ہے..... اصل پرکھ پرچول تو صاحب نے کرنی ہے.....(عقیل کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے فائل اندر لے کر جاتا ہے)

سین نمبر 9

مقام: باس کا ویل فرنشڈ کمرہ
کردار: میز کے پیچھے آرام دہ کرسی میں کمپیوٹر کی سکرین پر نظر جمائے بیٹھا ہوا باس اور کمرہ میں داخل ہوتا ہوا عقیل

عقیل: مے آئی کم ان سر.....!
باس: ہوں.....!(عقیل کی فائل کو غور سے دیکھتے ہوئے لمبی ہوں) گڈ..... ویری گڈ..... میٹرک سے ایم اے تک فرسٹ ڈویژن ہے آپ کی..... بیکی لینڈ.....(فائل سے نظر اوپر اٹھاتے ہوئے) بیٹھیے.....!
عقیل: تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ..... سر.........!(باس کے کمپلیمنٹ پر اعتماد بحال کرتے ہوئے عقیل باس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے)
باس: کھڑے ہو جایئے.....(عقیل کا بغور جائزہ لیتے ہوئے)
عقیل: جی.....!(پریشان ہوتے ہوئے)
باس: میں نے کہا کھڑے ہو جایئے (تحکم سے)
عقیل: جی.....جی.....!(کھڑا ہو جاتا ہے)
باس: پیچھے مڑیے.....!
عقیل: جی.....!(پریشان ہو کر)
باس: میں نے کہا پیچھے مڑیے.....!
عقیل: کمال ہے.....!(منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے پیچھے مڑ جاتا ہے)
باس: ہوں.....!(عقیل کا گھوم پھر کر چاروں جانب سے جائزہ لیتے ہوئے) سوٹ کب سے پہنتے ہیں آپ.....؟
عقیل: سر.....!ان باتوں کا میرے انٹرویو سے کیا تعلق ہے.....؟(زچ ہوتے ہوئے)
باس: آپ کی ملازمت سے تو شاید نہیں..... مگر.....اس سوٹ سے ضرور ہے.....!
عقیل: (جھینپتے ہوئے) سر..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.....؟
باس: میں ہمیشہ..... ماڈرن ٹیلر سے کپڑے سلواتا ہوں.....!(فخریہ انداز میں)
عقیل: جی سر.....!(ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے)
باس: جی.....!(گردن مٹکا کر)
عقیل: کیا عرض کروں سر.....!(شرمندگی سے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے باس کی طرف دیکھنے لگتا ہے.....(آہستہ آہستہ عقیل کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دور ہونے لگتے ہیں اور اس کی جگہ استہزایہ انداز ابھرنے لگتا ہے) سر.....!(اعتماد سے سینہ پھلاتے ہوئے) میرے ٹیلر کا نام مشرق ٹیلر ہے.....!
باس: (بیزاری سے) آپ کے ٹیلر کے نام سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے..... مشرق ٹیلر ہو کہ مغرب ٹیلر.....!
عقیل: گستاخی معاف..... سر..... اگر..... آپ بھی..... بٹ.....!
باس: (چونکتے ہوئے) ہیں.....!کیا مطلب ہے آپ کا.....؟(گھبراہٹ میں کوٹ کے بٹن کھول کر اندر جھانکتا ہے..... اور..... حیرت سے عقیل کا منہ تکنے لگتا ہے) ہوں..... تو..... ہاؤ..... از..... پاسبل.....؟
(آہستہ آہستہ دونوں کی خفت دور ہونے لگتی ہے اور دونوں ہی ایک ساتھ زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ ملانے لگتے ہیں جبکہ باس دوسرے ہاتھ سے کال بیل پر زور ڈالنے لگتا ہے)

سخنِ ماہتاب

ایک ہی موضوع پر دو نظمیں

ستیہ پال آنند

سن تو ستیہ پال آنند

سن تو ستیہ پال آنند
وید، شاستر، گیتا
عمر کی اکائیوں کو
آشرم سمجھتے ہیں
چار آشرم، جیسے
زندگی کے رستے میں
وقت کے پڑاؤ ہوں
عازمِ سفر ہونا
شرط ہے، مگر پھر بھی
ایک پر پہنچ کر ہی
دوسرے کو جانے کا
راستہ کھلتا ہے!

سن تو ستیہ پال آنند
تیرے جیسے لوگوں کا
حزینہ فقط یہ ہے
زندگی کو بچپن کی
کھیل کود، لڑکپن کی
عشق کو جوانی کی
آنکھ سے نہیں دیکھا
تم تو سیدھے بچپن سے
بوڑھے ہو گئے، آنند!

خود شناسی

لاغر تن
کمزور بدن
ڈھیلا ڈھالا سا اک فرغل
کندھوں سے لٹکا
ہڈیوں کا ڈھانچہ..... اک پُتلا
آنکھ مٹک کر
ٹھمک ٹھمک کر
گھوم کے اپنی چھب دکھلا کر
مجھ سے بولا
''تم پہچان نہیں پائے ہو مجھ کو شاید
وقت ہوں میں!
یاد ہے جب ہم پہلی بار ملے تھے، تو تم
ایک ستون تھے..... کڑیل، چوبی
لمبے، اونچے
آئینے میں دیکھو مجھ کو اور پہچانو!''

اور نہیں تھا کوئی بھی میرے آئینے میں!
اک سکوڑے مجھ کو تکتا
میرا عکس تھا.....لاغر تن
کمزور بدن
ڈھیلا ڈھالا اک فرغل پہنے
ہڈیوں کا ڈھانچہ.... اک پُتلا!

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

پنجابی کلام سے دو تازہ اور غیر مطبوعہ غزلیں

عشق دے قصیاں دِیاں رُتّاں گئیاں، موسم گئے
شاعراں دی بزم چوں وارث گئے، ہاشم گئے

وقت دے سورج دیاں کِرناں توں وی پگھلے نئیں
برف دی چٹّان وچ کجھ لوگ اِڈّاں جم گئے

شہر توں جد رُس کے ٹُریا کوڈیاں والا فقیر
دور تک اس نوں مناون شہر دے حاکم گئے

سُنجیاں گلیاں، کھلے بُوہے تے سب خالی مکان
اس نگر دے لوک پردیساں چ کیہڑے کم گئے؟

سُرخیاں لکھدے سی جو حاکم دے ظلماں دے خلاف
اجّ، سُندے آں کہ اُہ اخبار دے کالم گئے

کی دھتُورے دا نشہ سی، یا کسے جوگن دی آس؟
چلدے جوگی اپنی دُھونی وچ مسا[1]نیں رم گئے

ہُن نئیں یاداں دی خوشبو، ہُن نئیں چاہت دے پھُل
پھر کدی واپس نہ آئے، جد توں اُہ موسم گئے

دوست جد توں بھُل گئے رستہ مرے گھر دا آنند
انج لگدا اے کہ اس دنیا دے سارے غم گئے

[1] مسان = شمشان گھاٹ - رم جانا = دُھونی رما کر بیٹھ جانا

میز تے سُکیاں دواتاں سی، قلم ٹُٹّے ہویے
تے ادھورے، ادھ پچدّے شعر سی لکھے ہویے

کوئی وی ثابت نہ سی اس شہر وچ شیشے دا گھر
ہر گلی وچ پتھراں دے ڈھیر سی وِکھرے ہویے

خودکشی جائز اے قانونن، خبر سی شہر وچ
ریل دی پٹڑی تے لکّھاں لوک سی لیٹے ہویے

کی عجائب گھر اے میرے ملک دی تاریخ دا!
موم دے، سر توڑنا، بے جان بُت رکھے ہویے

فرق کی پیندا اے جد دل ہی قلندر ہو گیا
سوٹ[1] انگریزی ہویے یا ویس شاہ کالے ہویے

کجھ مٹاوَ اج تاں گھر آئے فقیراں دی پیاس
مدتّاں ہوئیاں تُسا نوں پُن دا کم کیتے ہویے

سامنے محبوب سی، پر تیاگ دی مورت آنند
واہ[2] کے کچھمن لیک اپنے گرد سی بیٹھے ہویے

[1] کالے مینڈھے کپڑے تے کالا مینڈھا ویس۔ اوگن بھریا میں پھراں تے لوک کہن درویس!

[2] لکشمن ریکھا۔ وہ دائرہ جو لکشمن سیتا کے گرد بنا کر رام کی کھوج میں گیا تھا اور اسے تنبیہ کر گیا تھا کہ ریکھا سے باہر مت آنا۔ ریکھا سے باہر آنے پر ہی اسے راون اغوا کر کے لے گیا تھا۔

○

رس رابطے

اعجاز کھوکھر

ذرّہ نگار گلزار جاوید صاحب، آداب۔

پچیس روزہ امریکہ، کناڈا کے مختلف شہروں کے مشاعراتی دورے کے بعد گھر لوٹا تو میز پر چہار سُو کے تازہ شمارے کو اپنا منتظر پایا۔ واہ واہ، سبحان اللہ بہت خوب شمارہ ترتیب دیا ہے آپ نے جن دنوں ''سمیّ'' تک میری موجودگی کا ذکر کیا ہے وہ میری زندگی کی جدوجہد کا زمانہ ہے۔ ان دنوں میں آزاد صحافی کے طور پر زندگی تلاشنے اور تراشنے میں مصروف تھا۔ میری خواہش ہے کہ میں، آپ اور آپ کے طرزِ زیست کی بابت اور زیادہ آگاہی حاصل کروں۔ میری جانب سے عزیزہ دینا جاوید اور تمام رفقائے کار کو نیک تمنائیں پہنچا دیجئے۔

(ندا فاضلی)

عزیزی گلزار جاوید صاحب، دعائیں۔

آپ نے چہار سُو کا تازہ شمارہ جناب ندا فاضلی سے منسوب کر کے ایک طرح سے بڑا ہی کارِ خیر کیا ہے۔ اس شمارے کے مطالعے کے بعد میں جناب ندا فاضلی کی نسبت پہلے سے بہتر رائے قائم کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔ میری طرف سے آپ اور ندا فاضلی صاحب کو مبارکباد پہنچے!

(ڈاکٹر وحید قریشی)

بھائی جان۔ آداب!

''چہار سُو'' کا شمارہ پہنچ گیا۔ میرا بھتیجا فاری شاہت بہادر ہے۔ اللہ اس کو اس محنت کا اجر دے گا کہ دور افتادہ چاچا تایا بھی رسالے کی راہ دیکھتے ہوں گے۔ اس بات کا خیال رکھتا ہے۔ آپ سے فون پر بات ہوئی۔ پنجابی ماں بولی کے دودھ کی شیرینی ابھی حلق میں باقی ہے۔ اب بھی کبھی کبھار کچھ نہ کچھ پنجابی میں لکھ لیتا ہوں۔ اچھا لگتا ہے۔ پورا رسالہ پڑھنے میں تو وقت لگے گا۔ لیکن سنت کی ندا فاضلی کے گوشے کے چیدہ چیدہ مندرجات پڑھ لیے ہیں۔ ان سے آخری ملاقات اکتوبر میں یہاں ایک نجی تقریب میں ہوئی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں دائیں بائیں ''گل اور شعر'' پھینکتے رہے۔ کچھ میرے حصے میں بھی آئے۔ میری بیماری کی تشخیص ہو چکی تھی اور احباب کو میرے موذی مرض کا پتہ چل چکا تھا۔ انہوں نے بھی کچھ دعائیہ کلمات کہے اور پھر اگلے شہر کے مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے چلے گئے۔ میں تو اب ندی کنارے کا ''رُکھڑا'' ہوں نہ جانے کب اکھڑ جاؤں۔ گلزار بھی ''سمیّ'' سے فون پر بات کرتے ہیں تو ہمت بندھاتے ہیں کہ تم ایک بار ضرور صحت یاب ہو کر لوٹو گے اور دوستوں کے ساتھ مل بیٹھو گے۔ ندا کا یہ شعر ہمت بندھاتا ہے:

خودکشی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی سب میں
اور کچھ دن ابھی اوروں کو ستایا جائے

(''اوروں'' کی جگہ اگر ندا ''یاروں'' لکھ دیتے تو مزہ دوچند ہو جاتا!)

کہانیوں میں سب سے پہلے جتندر بلو کی کہانی پڑھی۔ ذاتی واردات اور سماجی ''چکرویو'' میں پھنسے ہوئے مرد وزن کے ازدواجی رشتے کی استواری اور شکست وریخت بلو کی کہانیوں کا ایک اہم موضوع ہے۔ (حتیٰ کہ ان کا ناول ''شوالک گھاٹ'' بھی اس سے خالی نہیں!) اور وہ اسے خوب نبھاتے ہیں لیکن جو کڑی اس کہانی کی زنجیر کے آخر میں جڑ گئی ہے وہ اسے دیگر کہانیوں سے زیادہ معنی خیز بناتی ہے..... گلزار جاوید (کون ہے یہ شخص؟) کی کہانی ''تقدیس کا رشتہ'' زمان ومکاں کی تین پرتوں کو جوڑتی ہوئی شعوری رو کی مدد سے بآسانی آگے بڑھتی ہے، پیچھے ہٹتی ہے اور پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔ پیچھے ہٹتے ہوئے کہانی کا متکلم واحد سے جمع یعنی ''ہم'' ہو جاتا ہے اور لوٹ کر حاضر موجود پر پہنچتے ہی پھر واحد متکلم یعنی ''میں'' ہو جاتا ہے۔ تیسری پرت وہ مادیدہ شخصیت ہے جسے شفیعاں کا نام دے کر کہانی کار نے تاج محمد اور کہانی کے واحد متکلم کی collective سائکی پر تصویر کی طرح آویزاں کر دیا ہے۔ تاج محمد کی سائکی کا وہ حصہ جو Narrator اور شفیعاں کا مربوط ماضی ہے صرف ایک فقرے سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے ''شفیعاں تمہیں بہت یاد کر رہی تھی؟''..... شفیعاں کے نام پر تاج محمد نے ایک دفعہ ہماری جانب حیرت سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندی دوسرے ہی لمحے وہ پھر اجنبی بن چکا تھا۔

گلزار جاوید کی یہ کہانی یقیناً ایک بڑی کہانی ہے اور پڑھنے والے اسے برسوں یاد رکھیں گے اس لیے بھی کہ اسلوبیاتی سطح پر اس میں پنجابی (پوٹھوہاری) کی سوندھی سوندھی میٹھی چھاچھ کی چاشنی ہے۔ ساٹھ برس کے بعد کچھ الفاظ تو پہلی بار مجھ سے بھی نہیں پہچانے گئے۔

''سخن تازہ'' میں ڈاکٹر انور سدید اور امجد اسلام امجد صاحبان کی غزلیں پسند آئیں۔ ملک زادہ جاوید جو نئے نئے استعارے ایجاد کرتے ہیں بہت اچھے لگتے ہیں..... نظموں میں سب سے پہلے اپنے بچپن کے دوست اور ہم جماعت یونس صابر کی ''خوشحال و اقبال'' پڑھی۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ خوشحال خان خٹک پشتو کے اقبال ہیں۔ آج بھائی یونس صابر نے میرے جذبات کی ترجمانی کر دی۔ دیگر تخلیقات میں امجد اسلام امجد صاحب کی نظم اور ناصر شہزاد صاحب کا گیت بہت اچھے ہیں۔ ناصر شہزاد صاحب کا Refrain یا ٹیپ کا مصرعہ ''راجہ جی کا باغ'' لوک گیتوں سے مستعار ہے اور مجھے اس کی

تجدید بہت پسند آئی۔ دل خوش ہو گیا۔

ستیہ پال آنند

جنابِ عزم گلزار جاوید صاحب۔ السلام علیکم!

آپ اپنے چہارسُو کے قریب قریب ہر پرچے کی غزلوں میں غزل کو سرِ فہرست رکھتے ہیں۔ میں اسے آپ کی ادبی نجابت کہتا ہوں وہاں لئے کہ آپ کے قارئین میری غزل کا ذکر یا تعریف تو کیا کریں گے اُس کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مثلاً تازہ پرچے میں آپ نے پھر میری غزل کو سرِ فہرست رکھا ہے اور وہ صرف اس لئے کہ قارئین توجہ فرمائیں کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں لیکن اس دفعہ بھی ایک صاحب نے صرف یہ لکھا ہے کہ میں غزل میں تجربے کر رہا ہوں.... لیکن موصوف نے میرے تجربوں کے بارے میں نہیں لکھا کہ یہ تجربے کہاں تک کامیاب ہیں کہاں تک ناکام ہیں.... اصل میں سارا مسئلہ یہ ہے کہ جو غزل کو اگر عام ڈگر سے ہٹ کر غزل کہے گا تو اُس کی غزل کو پڑھنے کے لئے قاری کو زیادہ توجہ دینا ہو گی اور آج کل ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ ہم توجہ کے ساتھ کسی غزل کو پڑھیں۔ نئے تجربے والی غزل تو آپ کی توجہ کی زیادہ مستحق بھی ہے مستحق بھی.... مگر وہی بات کہ اتنی تگ و دو کون کرے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ عدم افضل صاحب نے بھی میری تازہ غزلوں کا مجموعہ دست بدست مجھ سے لیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں آپ کی غزلیں غور سے پڑھ کر آپ کو بتاؤں گا لیکن ان حضرت کے پاس بھی اتنا وقت کہاں کہ میری غزلیں پڑھتے اور ان پر کچھ لکھتے بھی..... بہر حال میں اپنا کام کئے جا رہا ہوں اور آپ بھی بہادری کے ساتھ میری غزلیں چھاپ رہے ہیں۔

مشکور حسین یاد

برادرم۔ السلام علیکم

میں چھ ماہ برطانیہ کے نجی اور ادبی دورے کے بعد واپس آیا ہوں تو اب آپ کا خط اور تازہ شمارہ ملا۔ بے حد شکریہ۔ برطانیہ میں لندن، برمنگھم، بریڈفورڈ، مانچسٹر، کیلے اور شیفلڈ میں ادبی تقریبات تھیں۔ ان میں شریک ہو کر اردو کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ زبان پھیلتے پھیلتے مغربی دنیا میں بھی سکہ جاری ہے اس کے چاہنے والے ہر جگہ موجود ہیں اور کثیر تعداد میں یہاں کے رہنے والے ان مشاعروں میں شریک ہو کر نہ صرف زبان اور ادب کے ساتھ محبت جتاتے ہیں بلکہ اپنی تہذیب اور ثقافت کا اظہار بھی اہلِ مغرب کو دکھا کر ان کے دل موہ لیتے ہیں۔ یہ آسان بات نہیں۔ میں تو ان کے منتظمین کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

'چہارسُو' اپنی روایتی شان و شوکت اور ادب دوستی کی وجہ سے مقبول و محترم ہے اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ اپنی پرانی نہج و ڈگر برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس بے ادبی کے عہد میں یہ ادبی خدمت قابلِ تحسین ہے۔

محسن احسان

برادرم گلزار جاوید صاحب۔ تسلیمات۔

سب سے پہلے "عدم افضل" پر خصوصی گوشہ کے لئے مبارکباد اور شکریہ کہ آپ نے "جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ" پر تبصرہ شائع کیا ہے اور اس طرح اردو کے ایک اہم شاعر کی طرف اپنے قارئین کو توجہ دلائی۔ میرا خیال ہے کہ جوش لائقِ توجہ ہیں بقول فیض احمد فیض جوش سے اختلاف بھی آسان ہے لیکن فن کی اردو زبان کے لئے خدمات سے انکار بھی ممکن نہیں۔

عدم افضل پر گوشہ ضروری تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ ایک توانا شاعر ہیں۔ جوش اور جذبے سے بھرے ہوئے۔ انہیں اپنی شاعری میں مزا آتا ہے۔ پوری دل جمعی سے شعر کہتے ہیں اور فن کی سادہ زبان اور دور رس نگاہ لائقِ داد و تحسین ہے۔ ان دنوں بہت سے شاعر یہ احساس دلا رہے ہیں کہ وہ خود بجھے ہوئے ہیں اُس لئے دوسروں کے لئے بھی زندگی میں کچھ باقی نہیں ہے۔ مجھے عدم افضل کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ خوشی ہوئی کہ ایک اچھے شاعر کے ساتھ وقت گزرا۔

آپ نے مجھے بھی عزت بخشی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ آپ کی دوست نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

محمد علی صدیقی

محبی گلزار جاوید صاحب۔ اسلام مسنون

'چہارسُو' کا تازہ شمارہ جس میں قرطاسِ اعزاز محمد علی صدیقی کے نام ہے، برادرم کنول ظہیر صاحب کے توسط سے موصول ہوا۔ پاکستان میں ڈاک خرچ کے غیر معمولی اضافے کی وجہ سے پاکستان کے کئی رسالوں کی ترسیل یہاں بند ہو گئی ہے۔ آپ کی ہمت ہے کہ آپ ہم لوگوں تک چہارسُو پہنچانے کی سبیل کر لیتے ہیں۔

محمد علی صدیقی ہمارے عہد کے بہت اہم ناقد ہیں۔ اُن پر بھرپور گوشہ نکال کر گویا آپ نے ایک طرح سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ حسبِ معمول یہ گوشہ بھی بڑی محنت اور محبت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں محمد علی صدیقی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آپ کے مساعی سے ان کی زندگی کے بہت سے گوشے اجاگر ہو گئے ہیں۔

کمپوزنگ کی غلطی کی وجہ سے رفعت سروش کی دو پری دوہا جیسی کی صورت ہی مسخ ہو گئی ہے۔ کم از کم شعری حصے میں تو پروف ریڈنگ زیادہ توجہ سے ہونی چاہیئے۔

ازیں بعد اہلِ فکر صاحب کی کرم فرمائی اور آپ کی محبت کی

بدولت 'چہارسُو' کا نیا شمارہ بہ گوشۂ عرفان فضلی نمبر موصول ہوا۔ پڑھ کر مسرت ہوئی۔ عرفان فضلی صاحب جتنے اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ مجھے ان کی نثری تحریریں خاص کر دیباچوں کے پیچ دیباچوں کے ابہام اور چہرے زیادہ پسند ہیں۔ شاعر بھی وجیہہ اور جینٹل اور لائق و فائق ہیں۔

مصطفیٰ کریم کا ناول طوفان کی آہٹ اگرچہ میں نے نہیں پڑھا ہے کیونکہ یہ کتاب مجھے ملی ہی نہیں لیکن ارمان نجمی نے اس کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس سے اس ناول کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کل کملیشور کا ناول کتنے پاکستان (اردو ترجمہ) پڑھ رہا ہوں۔ میں اپنی معمولی علمی بساط کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ و تہذیب کے موضوع پر اتنا دلچسپ، فکر انگیز اور غیر جانبدارانہ ناول لکھا ہی نہیں گیا۔ پروفیسر خیال آفاقی سے اپنے شعر کی بابت میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ آتش کا شعر انیسویں صدی کے تھمے جاتے معاشرے کی سوچ کا مظہر ہے اور نامی انصاری کا شعر اکیسویں صدی کے غیر یقینی معاشرے سے اُپجا ہے اس لئے دونوں کا فرق معلوم!

نامی انصاری

محبِ گرامی آرزوئیں

"چہارسُو" باقاعدگی سے مل رہا ہے اور آپ کی توجہ (باوجود اپنی عدم توجہ کے) کا سوچ کر بے پایاں شرمساری محسوس کرتا رہتا ہوں۔ خیالات ہی خیالات میں آپ سے رابطے کے مضامین باندھتا رہتا ہوں لیکن بچی کے حادثے کے بعد سے ذہنی یکسوئی مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اکثر ارادہ کرتا ہوں توڑ دیتا ہوں اور خیالات میں اترنے والے مضامین کاغذ پر اتر نہیں پاتے۔ بس آہستہ آہستہ بکھرتا جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ میری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے رہیں گے۔

مرتضیٰ برلاس

پیارے بھائی گلزار جاوید!

'چہارسُو' کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ تم سے تیس سال کے بعد فون پر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ اللہ تمہیں خوش، تندرست اور ادبی طور پر فعال رکھے۔

متذکرہ شمارے میں پروفیسر خیال آفاقی نے میرے ایک شعر پر اعتراض وارد کیا ہے کہ میں اور ئیں میں کیا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی انا کا نکتہ اس سے تشفی نہ ہوگا اور پھر میں اور ئیں کی قرأت میں جو ایک ہلکا سا توقف ہے اور جو سانس کا ٹھہراؤ ہے اس کا علم بھی انہیں بخوبی ہونا چاہئے۔ انسانی خصلت ہے کہ ہم اپنے ذہن میں ایک مفروضہ پہلے قائم کر لیتے ہیں اور پھر اس کے درست ہونے کے دلائل ڈھونڈتے ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ پروفیسر صاحب کیا پڑھاتے ہیں۔ شاید زبان پڑھاتے ہوں۔ سوال کے لیے چالیس منٹ بے کتنا بڑا سانس لے کر بولنا ازحد ضروری ہے کہ ایک ہی لڑی اتنے ہی وقت پر موقوف ہوتا ہے جو انہیں گاندھی جی کی بکری کی طرح میں یاد آ گئی۔ یہ میرے علم میں اضافہ کا باعث ہے کہ وہ اشعار کو بھی طالب علموں کی طرح رٹنے کے انداز میں پڑھتے ہیں۔ بہرکیف میں ان کا مشکور ہوں کہ انہوں نے میرے کسی شعر کو دریافت تو کیا چاہے وہ برائے تنقید ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

کرشن کمار طور

برادرم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

'چہارسُو' پابندی سے مل رہا ہے۔ شکریہ۔ میں 'چہارسُو' میں شائع ہونے والے افسانے غور سے پڑھتا ہوں۔ آپ اپنے سمیت اچھے افسانے شائع کر رہے ہیں۔ جتندر بلو نے اچھے افسانے لکھے ہیں.... لیکن 'چکر' میں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوہرانے لگے ہیں۔ حصہ شاعری میں ذرا ہاتھ سخت رکھیے۔ ضروری نہیں کہ بڑے ناموں کی ہر شے معیاری ہو۔

شمشاد احمد

میرے سادہ، نایاب، بے مثال گلزار جاوید۔

آپ ہمیشہ قرطاسِ اعزاز پر نیا تابندہ ستارہ جگمگا دیتے ہیں۔

نظموں کے دوسرے حصے پڑھ کر جی خوش ہوا۔ کینیڈا سے بیدار بخت کی رائے نے مرعوب کیا "آپ کی نظم نے ایک پیکر تراشا ہے۔ یہ تو میرے دل میں تھا۔ یہ تصویر تو میں دیکھ چکا ہوں۔ بلکہ شکر گزار ہوں اس وسیلے کا جس نے یہ تصویر ایسی مصور کر دی کہ میں سب کچھ بھول کر اس میں ایسا کھویا کہ نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔"

فن کا انداز بیاں اچھوتا اور نرالا ہے۔ داد تو بہت دیتے ہیں مگر کسی نظم کو اس طرح سے سراہنا اس کا جواب نہیں۔ اور عرفان فضلی کا مضمون شبستانوں کے عاشق سردار جعفری پر بھی خوب ہے۔ براہِ راست میں آپ کے سوالات اور ندا کے جوابات دلچسپی سے خالی نہیں یعنی کہ زندگی ایک سفر ہے اور سفر میں ہر منظر دوسرے منظر کے بدلنے تک آنکھ میں رہتا ہے یعنی۔

پہلے جیسا ہی ذکی ہے آج بھی بڑھ جا کبیر
کوئی آیت کا مخالف، کوئی صورت کے خلاف

عرفان فضلی پر مضامین بھی اچھے ہیں۔ پروفیسر شفیق اللہ کا مضمون "گذرے ہوئے کل میں کوئی ترمیم نہیں" باوجود طوالت کے دلچسپ ہے۔ انور ظہیر خاں کا زندگی کی کشتی اور عرفان فضلی میرے مولا تیری دہائی ہے۔ پروفیسر قائم امام اور رتن سنگھ کا دیواروں کے بیچ گھرا عرفان فضلی پسند آئے۔

"تم سے محبت سب کو" کی آرا بھی خوب ہیں۔ جتندر بلو کا افسانہ "چکر" طویل ہے مگر اس کا احساس قاری کو ہونے نہیں دیا۔ اور اس خوبصورتی سے نبھایا کہ دلچسپی قائم رہی تھی۔ "ڈاکٹر کا ابھرتا ہوا سینہ یک بہ یک

اندر کی طرف چلا گیا۔" اور "کل رات جو کچھ یا گھناؤنی اور ذلیل حرکت تم نے کی ہے وہ بھلائے نہیں بھولے گی۔ انگیٹھی لیتے وقت تمہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا اور نہ ہی تم نے سوچا کہ تمہاری بیوی ہے کوئی بازاری عورت نہیں To hell with you۔" کیا خوب انداز ہے اور کی ہے سال کے منظر کی آخری شام اچھا لگا میری جانب سے "شاباشی" قبول کریں۔ مشتاق انگی کا "خلا" اور فرخندہ شمیم کا "کہیں داغ نہ لگ جائے" پسند آئے اور آپ کا "تقدیس کا رشتہ" آپ تو گزرے وقت کی یادیں تازہ کرانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ حیران ہوں کس طرح آپ کو چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی اس طرح یاد رہتی ہیں جیسے وہ ساری پچھلی شام کی بات ہو۔ کیا کیا نقشہ باندھا ہے "تین جگہ جگہ سوراخ زدہ تھے جس میں کپڑے کے چھوٹے لگا کر ڈاٹ کا کام لیتا۔" اور خاص طور سے تاج محمد کا پیٹی میں مٹی کا ڈھیلا رکھنا اور ٹین میں آواز آنا بھی خوب انداز ہے اور جس طرح ساتھ والے کھیت کے مالک سے بچوں کے لئے خربوزہ لینے کا انداز بھی خوب ہے۔ کہانی پڑھتے پڑھتے قاری ان دنوں کی گزرے وقت کی باتوں میں کھو جاتا ہے اور حسب معمول آپ تاج محمد جس نے ہر موقع پر دوسروں کی خدمت کے لئے خود کو وقف کیا وقت اور حالات نے کس قدر بے دردی سے تقدیس کے رشتے کو تذلیل کے رشتے میں تبدیل کر دیا۔ آنکھیں اشک آلودہ ہو جاتی ہیں۔ آپ نے تلخ حقیقت کو کس قدر سادگی سے بیان کر ڈالا ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

حصہ غزل اور نظم حسب معمول خوب ہے۔ ہر غزل اپنی جگہ اچھی ہے انور سدید کی غزل کا یہ شعر:

جن کی لاشیں اٹھا لائے دیارِ غیر سے\
وہ گئے تھے گھر سے کچھ ڈالر کمانے کے لئے

جب کہا اُس نے کہ میں گونگی ہوں بہری ہوں\
پاس میرے کچھ نہ تھا اُس کو سنانے کے لئے

اور محمود احسن کی غزل کا مقطع:

چشم نم محمود جب لے کر گیا فن کے حضور\
ایک پل میں بارشِ لطف و کرم ہونے لگی

"اردو زبان اور لسانیات... گوپی چند نارنگ کا موقف" ڈاکٹر مشتاق صدف کا مضمون بہت پسند آیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے نیک اور عالم شخص سے متعلق ایسے خیالات اور اعتراض جو بے جا ہی نہیں بلکہ اعتراض کرنے والے کی نا اہلیت اور بے وقوفی کا ثبوت ہیں۔ میں مشتاق صدف کو ایسے اچھے مضمون کے لیے مبارک باد دیتا ہوں۔ امجد اسلام امجد کی نظم "کھلونے" پسند آئی۔ اب کہاں وہ سادگی اور سادہ لوح بچے۔ یہ تو ایک خواب تھا۔ خیال آفاقی کی غزل کے سب ہی اشعار پسند آئے:

کہاں کے رنگ و بُو کیسا اُجالا کیسی آوازیں\
مرے ہوتے تلک ہیں سب حقیقت میں جہاں کیا ہے

جو صورت میں ہے وہ دیکھ لیتی ہیں اُسے آنکھیں\
کسی کو کیا خبر سینے میں کیا دل میں نہاں کیا ہے

حمیدہ معین رضوی کی غزل کے اشعار پسند آئے مقطع کچھ ذرا زیادہ ہے:

میں کہتی ہوں اسلاف کی عظمت کا بھرم رکھ\
وہ کہتے ہیں مغرب کے پڑھائے ہوئے ہم ہیں

نیلمت تحریک کا دوسرا اور تیسرا دور "حمیدہ معین رضوی" کا مضمون خوب محنت کی گئی ہے اور حوالوں کے ساتھ اچھا خاصا دلچسپ بنا دیا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ

برادرم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

نومبر، دسمبر ۲۰۰۲ کا "چہارسُو" ملا اور حسب معمول آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنا پڑا۔ آپ جس طرح بھارت، پاکستان اور دیگر ممالک کے اہل قلم کی کاوشیں پیش کر رہے ہیں امید ہے اس کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔ وجہ بھی ہے کہ ادیب کا وطن ہوتا ہے مگر ادب سرحدوں سے بے نیاز ہوتا ہے محترم مہدی افاقلی کی بابت پڑھ کر اچھا لگا۔ حصہ نظم و نثر خوب ہے تاہم امجد اسلام امجد، پرویز ساحر اور سہیل غازی کی تخلیقات بہت اچھی لگیں۔ سہیل غازی بہت محبت کے آدمی ہیں۔ کراچی میں اہل قلم کا مشکوم سوا گت کرتے ہیں ہم بھی ان کے مقروض ہیں۔ جتیندر بلو کا "چکر" ڈاکٹر رینو بہل کا "سائے ڈھلے" اور آپ کا "تقدیس کا رشتہ" خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ماجد سرحدی

مکرمی و محترمی گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت۔

"چہارسُو" کا زیر نظر شمارہ ہر اعتبار سے وقیع ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی پر لکھے گئے کئی مضامین بہت اچھے ہیں۔ شعری حصہ بھی جاندار ہے۔ افسانے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ اور اب دوہے کے بارے میں مختصراً عرض ہے۔

دوہا ایک اردھ سم ماترک چھند یعنی بڑی چھند ہے اس چھند کے ہر پد (چرن) میں یکساں ماترائیں نہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ اردھ سم ماترک چھند ہے اس کے پہلے اور تیسرے وشم اور دوسرے و چوتھے پد سم چرن

کہلاتے ہیں۔ وشم چرنوں میں ۱۲ ماترائیں اور سم چرنوں میں ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کے ایک مصرعے (دو چرنوں) میں ۲۴ ماترائیں ہوتی ہیں۔ پہلے مصرعے میں پہلا اور دوسرا چرن اور دوسرے مصرعے میں تیسرا اور چوتھا چرن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا اور چوتھا چرن سم کہلاتا ہے جس کی ماترا ہوتا ہے اور آخر میں لگھو وزن یعنی فاع (VI) کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کام۔ نام۔ بات۔ ہاتھ۔ رات۔ پاس۔ آگ۔ دور۔ جور وغیرہ دوہے میں ماتراؤں کی پابندی بے حد ضروری ہے ورنہ اسے گایا یا پڑھا نہیں جا سکتا۔ دوہے کی مذکورہ بالا "تعریف" کو ذہن میں رکھتے ہوئے زیرِ نظر شمارے کے صفحہ نمبر 88 پر محترم سجاد مرزا صاحب کے دوہوں کو پڑھا تو انتہائی مایوسی ہوئی۔ طوالت کے خوف سے دوہوں کا تجزیہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اردو زبان میں دوہا کو اس کی اصل شکل و ہیئت میں اختیار کیا گیا ہے اور برتا بھی گیا ہے۔ دوہا کے فن اور تکنیک کے مطابق معتبر اردو شعراء نے اردو میں بہت اچھے دوہے کہے ہیں۔

اور ہاں اس رابطے میں ستیہ پال آنند صاحب کا خط بھی پڑھا وہ لکھتے ہیں "اردو صاف کیجیے کا ایک نہایت احسان فراموش زبان ہے کتنے کوہر جن کی چمک دمک آب و تاب آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی مٹی میں رل گئے اور کسی نے نہ پوچھا۔" مجھے اس سے مطلق اتفاق نہیں۔ ہر ایک گوہر کی اردو نے قدر کی عزت افزائی کی اور اسے اس کا جائز مقام بھی عطا کیا۔ منشی پریم چند رتن ناتھ سرشار کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی اوپندر ناتھ اشک، مالک رام، کالی داس گپتا رضا، کنہیا لعل کپور، جگن ناتھ آزاد، گیان چند جین، جوگیندر پال، گوپال متل اور گوپی چند نارنگ وغیرہ وغیرہ اور شعراء میں پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، جگت موہن لعل رواں، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا، جگن ناتھ آزاد اور بلراج کومل وغیرہ وغیرہ کو اردو نے حسبِ حیثیت ان کا مقام متعین کیا۔ ان کی عزت افزائی کی۔ خود ستیہ پال آنند صاحب کو بھی اردو ہی نے ایک شناخت عطا کر دی ہے اور ضرورت سے زیادہ ان کی پذیرائی کی ہے۔

کاوش پرتا پگڈھی

محترمی گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ اس مرتبہ خیریت کے ساتھ مجھے مل گیا ہے جس میں آپ نے قرطاسِ اعزاز "عدا فاضلی" کے نام کیا ہے۔ میں کیا میری طرح اور بھی "چہارسُو" کے قاری آپ کی اس پیش کش کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ شمارہ ملتے ہی میں نے پہلی فرصت میں موصوف کے بارے میں جاننے کی کوشش کی کیونکہ شاید آٹھ دس سال پیشتر جب ان کی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" قسطوں میں "شاعر" بمبئی (بھارت) میں شائع ہو رہی تھی اس وقت سے ان کے بارے میں تفصیل جاننے کی کوشش میں تھا مگر

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بہت سارے جذبوں تلے دب گیا اب دوبارہ ان کی شاعری کے گوشے کھلے تو پھر زیادہ ذکر "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" کا دیکھ کر ان کتابوں کی تلاش ہنگامی بنیاد پر کی وہ تو بھلا ہو کتابوں کی بین الاقوامی نمائش کا جو یہاں ۱۳ دسمبر ۲۰۰۶ء بائیکسپو سینٹر میں لگی تھی۔ میں نے فوراً آخری دن (جمعتی پر سوں) وہاں کا رخ کیا "انجمن ترقی اردو (ہند)" کی اسٹال میں اس کی آخری جلدیں بچی ہوئی ملیں اور اب میں اس کے مطالعے میں لگا ہوا ہوں۔ عدا فاضلی جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا صاحبِ طرز ادیب ہے۔ عدا کی نثر کے بارے میں مرحوم مشفق خواجہ کے اس خیال سے صد فی صد متفق ہوں "اسلوبِ بیان کے اعتبار سے آپ نے آپ بیتی نہیں لکھی ادب تخلیق کیا ہے یہ اسلوب دوسروں سے مختلف بھی ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد بھی .... ایسے ہی کام کارنامہ کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں" عدا فاضلی پر یہ قرطاسِ اعزاز یقیناً آپ کی تخلیق کا اعلیٰ معیار قائم کرتا ہے مبارک ہو۔

جتیندر بلو کا "چکر" بھی یقیناً ان کی سابقہ کہانیوں کی طرح مضطرب کا ئنس زدہ کا نامہ ہے میں ان کی کہانیوں کو اس زمانے سے پڑھتا چلا آ رہا ہوں جب یہ "شمع" (نئی دہلی بھارت) میں دھڑلے سے چھپتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ افسانوں کا واحد متکلم واقعتاً افسانہ نگار نہیں ہوتا لیکن جو کچھ میں نے مجموعی طور پر ان کے افسانوں سے اخذ کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ کسی شدید قسم کے جنسی complex کا شکار ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں افسانے کا لبادہ چاک کر کے باہر آ کر مجھ جیسے قاری پر اپنی حقیقت آشکار کر دیتا ہے۔ آپ نے غزل چھاپی۔ شکریہ۔ لیکن مطلع تین میں قافیے بر بار کو بر با بر لکھ کر مجھے غزل کی دلہیز سے باہر کر دیا ہے۔ براہِ کرم اپنے کمپوزر کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیے۔

غالب عرفان

مکرمی جناب گلزار جاوید۔

میرے لئے آپ کو خط لکھنا باعثِ مسرت ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد اُس سرزمین پر ایک دانشور اور صحافی کو خط لکھ رہا ہوں جہاں میری پیدائش ہوئی تھی۔ وہاں کی ایک ایک چیز سے میرا دلی لگاؤ ہے اُس کا خیال آتے ہی دل اچھلنے لگتا ہے۔ یوں تو لاہور کے ایک صاحب جو تخلیق ماہنامہ شائع کر رہے ہیں۔ اظہر جاوید صاحب یہاں تشریف لائے تھے اور ہریانہ اُردو اکادمی کے مہمان تھے۔ میری اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کے پرچے میں گذشتہ سال میرا افسانہ "حسرت گناہ" ماہ جون کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ آپ کا پتہ معلوم ہونے پر آپ کو اپنا ایک طبع زاد افسانہ "تشخص" ارسال کر رہا ہوں۔ ڈاک خرچ زیادہ ہونے کے باعث اس افسانے کو پہلے جس

کاغذ پر رقم کیا گیا تھا وہ کافی بھاری تھا۔ سے دوبارہ ہلکے باریک کاغذ پر رقم کرانا پڑا۔ یہ آپ کی خدمت میں خلوص کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ آپ کو کیسا لگتا ہے۔ آپ کے ردعمل کا انتظار رہے گا۔ جس شمارے میں آپ اسے شامل کریں اس کی ایک کاپی ارسال فرمائیں تا کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جا سکے۔ اگر ممکن ہو تو کسی صحافی انجمن کی وساطت سے یہ معاملہ اٹھائیں کہ دونوں ممالک کے مابین ڈاک کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے ڈاک ٹکٹ کے نرخوں میں کمی لائی جائے تا کہ اخبارات و رسائل ایک دوسرے ملک میں آتے جاتے رہیں اور تخلیق کاروں کو ڈاک خرچ کا زیادہ بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔

کیدارناتھ شرما

عزیزی گلزار جاوید السلام علیکم۔

زیرنظر شمارہ اپنا روایتی انداز لئے ہوئے ہے۔ اس بار قرطاس اعزاز کے مستحق عرفان علی صاحب ٹھہرے ہیں۔ خوب محفل سجائی ہے۔ سبحان اللہ۔ البتہ ایک نوالے میں کنکر آ گیا۔ براہ راست میں آپ کا سوال۔ "کہتے ہیں جس قدر کھلواڑ خدا سے آپ نے اپنے کلام میں کیا ہے کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔" اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ شاعر موصوف خدا سے کھلواڑ کرتے آئے ہیں۔ کیا خدا کو بھی ان دو والوں نے اپنی طرح کا کوئی شاعر سمجھا ہے کہ اس سے کاروباری رقابت کے منفی جذبات کا اظہار کیا جائے۔ بتایئے تو کھلواڑ کر کے کیا بگاڑیں گے یہ خدا کا؟

جن کو نہیں خود اپنی ضرورت پہ اختیار
وہ دیکھتے ہیں حوصلے پروردگار کے

مذکورہ سوال کے جواب میں صاحب قرطاس اعزاز کیا فرماتے ہیں ذرا وہ بھی ملاحظہ کیجئے "خدا کے وجود کا انکاری میں ہرگز نہیں ہوں، ہاں یہ ضرور ہے میں اسے محدود کر کے نہیں دیکھتا۔" بالکل یوں لگتا ہے جیسے دستور ہند کی کسی شق کے بارے میں اپنی مشروط رائے کا اظہار فرما رہے ہوں....
خدائے لایزال وہ ذات لامحدود ہے جو ساری کائنات کو محیط ہے اس کے لئے یہ تصور ہی مضحکہ خیز ہے اسے زمان و مکان کے حوالے سے تسلیم کیا جائے! وہ زمین و آسمان کا نور ہے۔ ہر شے میں اس کا ظہور ہے۔ نومولود بچے کی مسکراہٹ ہو کہ ماں کی ممتا اس کی صفات کو بھی محدود تصور کرنا خدا ناشناسی کا ثبوت ہے۔

کلی سے کہکشاں تک تو ہی تو ہے
زمیں سے آسماں تک تو ہی تو ہے

تاہم اس ذات باری کو اگر کھلواڑ محض شوخیاں اور دیکھنے کی چیز سمجھتے ہیں تو یہ دراصل ان کا حقیقت سے گریز اور اس پابندی سے فرار کا ایک بہانہ ہے جو انسان پر اس کے بنانے والے نے عائد کی ہیں۔ درست ہے کہ وہ بچے کی مسکراہٹ سے لے کر درختوں کی لہلہاہٹ تک میں جلوہ نما ہے لیکن محبوب کی ناز و اداؤں سے لطف اندوز ہونے کا نام ہی عشق نہیں ہے۔ حسن کے تقاضوں کی پاسداری عشق کے دعوے کی صداقت عشقی ہے ورنہ تو حقیقت حسن کی محض نظارہ بازی خود غرضی اور جی خوش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ بقول عرفی

خیال خاطر محبوب شرط دیدار است
بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی ست

زیرنظر شمارے میں مدیر چہار سُو کے کہانی کار گلزار جاوید کی تخلیق "نقد لیس" کا رشتہ نہایت ہی دل گداز تحریر ہے۔ اس میں پیش کردہ صوری مناظر سے وہی شخص حظ اٹھا سکتا ہے جس نے شہر کی استوری بلڈنگوں اور مشینی بھاگ دوڑ سے ہٹ کر کبھی دیہی زندگی کے فطری ماحول میں سانس لیا ہو۔ تب ہی وہ اس فرق کو محسوس کر سکے گا جو شہر کے آکسیجن سلنڈر سے اور کھیت کھلیانوں، ندی اور آبشاروں اور کہساروں کی کھلی فضا میں سانس لینے میں ہوتا ہے۔ دراصل گلزار جاوید نے جس خوبصورتی کے ساتھ دیہی زندگی کو بہانہ بنا کر اس المیہ کی نشاندہی کی ہے جو جام لئے بغیر بھی اپنے بہروپ میں منظر بن کر ہمارے روبرو آتا ہے وہ فن کی فنکارانہ چابکدستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
جتیندر بلو کا چکر اور ڈاکٹر رینو بہل کی کہانی سانجھے چولہے بھی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہے۔ درج ذیل اشعار میں سے کچھ دل کو گدگداتے اور کچھ فکر کو چونکاتے محسوس ہوتے ہیں۔
جن کی لاشیں ہم اٹھا لائے دیار غیر سے/وہ گئے تھے گھر سے کچھ ڈالر کمانے کے لئے (انور سدید) سفر میں ریت کے ٹیلوں پہ مت بھروسہ کرا کر یہ نشان تو اکثر بدلتے رہتے ہیں (امجد اسلام امجد) (محمود الحسن صاحب کی نعتیہ غزل کو سلام)۔ کار جہاں دراز میں الجھے ہیں اس طرح/اب تو کسی کو کوئی پہچانتا نہیں ہے (ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ) بہاریں لوٹ آئی ہیں گلستاں تمنا میں/ہوئی خون جگر میں جب بھی لالے کی حنا بندی (سرور انبالوی) سب اپنے اشتہار لگانے کو آئے ہیں/میں بھی ہوں جیسے ایک بڑی دیوار کی طرح (اکبر حمیدی) قانون ہو تحفظ کا یا قانون ہو قانونی/بحثوں میں عدالت کا کردار الجھتا ہے (غالب عرفان) میں کہتی ہوں اسلاف کی عظمت کا بھرم رکھو/وہ کہتے ہیں مغرب کے پڑھائے ہوئے ہم ہیں (حمیدہ معین رضوی) کیا ہے عجب دیا پہ جب مجھے فائز/نکلے دشت کی جانب بھی موڑ دے مجھ کو (فروغ رضوی) اڑ گئے چونچ میں قفس لے کر/اب پرندوں کے یہ حوصلے دیکھئے (پروفیسر زہیر کنجاہی کی طلب کو سلام) کو تھا گھر ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا/گھر سمجھ کے پھر بھی ہم رہتے رہے (شگفتہ نازلی) یہ کیسا بیٹا ہے جو بتا ہے ماں سے دور/لگا کے یہ ماں ہے یاد کیا کرتی ہے دعاؤں میں (حفیظ انجم کریم نگری) ڈھونڈ پایا تو یہ مری ہی کا عکس تھا/کل آذر کوئی خالی شکل ہر سے ... میں

(علی آذر) تمام شہر تو بے فکر سو رہا ہے مگر / نہ جانے کس لئے بے چین ہو رہا ہوں میں (سیفی سرونجی) جو زندہ آگ میں ڈالے گئے لاشیں نہ کہیں ان کی / جو بچ نکلے ہیں ان کی تخت جاں کا تماشا کر (اسلم محمی) میں کہ پانی ہوں کسی ڈھلوان سے اترا ہوا / اس جگہ ہیں پستیاں میں ہوں جہاں ٹھہرا ہوا (تصیر نوری) ہر اک شکست کو اس عزم سے قبول کیا / میں جیت جاؤں گا آخر یہ ہار آخری ہے (طالب انصاری)

خیال آفاقی

جناب گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون

آپ کے بھیجے ہوئے تمام شمارے موصول ہوتے رہے ہیں۔ آپ کی عنایت کے لئے صد درجہ مشکور ہوں۔ افسوس کہ بعض ناگزیر مصروفیات کے باعث شکریہ کا خط نہیں لکھ سکی۔ امید ہے آپ میری جانب سے ہونے والی تاخیر کے لئے میری معذرت قبول فرمائیں گے۔

قرطاسِ اعزاز کے ذریعہ آپ کا بے حد اہم ہستیوں سے متعارف کرانے کا جو سلسلہ ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کا افسانہ "مشتاق نگاہیں" بہت پسند آیا۔ اب سے ٹھیک ایک ماہ بعد نمائش شروع ہوگی۔ یہی سب کچھ ہوگا جو آپ نے تحریر کیا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ بات جب "مشتاق نگاہوں" تک پہنچی تو ایک ہی دعا کرنے پہ سے میلے کو ملیا میٹ کر دیا اور پھر بے نگاہی، بے اشتیاقی اور بے نوائی کا ہی ایک سلسلہ تھا۔ امید ہونے کی ضرورت نہیں۔ چاہتوں اور دعاؤں کا دور ختم ہوگا۔ انہی دعاؤں سے انسانیت اپنا رخ زیبا دکھائے گی۔ بستیاں بسائی جائیں گی۔ آدمیت کا چمن پھر آباد ہوگا۔ مشتاق نگاہیں بھی تھک کر ہار ماننے والی نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنے فن میں خاصی مشتاق ہیں۔ جانے کتنی چشم غزال پُرنم کشش اور مشتاق نگاہیں آج بھی محوِ انتظار ہیں اور رہیں گی۔

حنا محمود

محترم گلزار جاوید صاحب

گلزارِ ادب میں چہارسُو کی خوشبو چہارسو ہے اور آپ کی خدمات و کاوش جاویداں۔ آپ جس انداز میں بزرگ اہلِ قلم کی خدمات بلکہ احسانات کا اعتراف کرتے ہیں وہ قابلِ تحسین اور قابلِ تقلید ہے۔ ایسے کاموں پر ستائش کی صدائیں فوراً بلند نہیں ہوتیں۔ ذرا وقت کی گرد بیٹھ لینے دیجئے پھر جاوید کے ان گلزار شماروں کی خوشبو کے تعاقب میں محقق و ناقد سرگرداں رہیں گے کوئی تحقیق آپ کے شماروں کو شمار کئے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ پہلے صفحہ پر آپ کے نام کے اوپر ایک "دادا" کا نام ہے تو نیچے "بیٹا" کا گویا دادا و بیٹا کا ساتھ رہا ہے۔ حضرت ضمیر جعفری انہیں مرحوم لکھنے کو ضمیر اب بھی تیار نہیں ("مرحوم" بہ لطافتِ وصال و مندرجہ کی طلب میں حیات و ممات کی تفریق ہی کیا)۔

عطا عاشقی تو ان محسنینِ ادب میں سے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اردو کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ بمبئی والے لائق ارام صدیقی صاحب "شاعر" عطا فرماتے ہیں اس میں عطا عاشقی صاحب کی تخلیقات دیکھنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس مرتبہ شاعر نے عاصی کاشمیری پر بہت اچھا گوشہ نکالا ہے۔ آپ کے یہاں عبدالاحد ساز نے عطا کے کلام سے لاجواب انتخاب کیا ہے۔ اس میں ان کے والد کی وفات پر نظم نے دل کھینچ لیا۔ ایسی ہی کیفیت میری اس وقت ہوئی تھی جب میں نے نتاج قائم خانی کی نظم والد کی وفات پڑھی تھی۔ ماں باپ سے محبت تازہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر مسرور احمد زئی

محترم جناب گلزار جاوید صاحب، آداب!

امید ہے آپ شگفتہ اور شاداب ہوں گے۔ سب سے پہلے نئے سال کی مبارکباد قبول فرمائیے۔ شگون کرتے آنے والا نیا سال آپ کے اور آپ کے پیارا اور "چہارسُو" کے لئے ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابی لے کر آئے۔ جولائی اگست کا شمارہ بھی آپ کی کاوشوں کا احساس دلاتا ہے۔ آپ کی محنت رنگ لائی ہے۔

رسالے کے مضامین شعری حصہ اور افسانے تعریف کے قابل ہیں۔ ان کا انتخاب بہت ہی سوجھ بوجھ سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا مضمون "عصمت چغتائی حقیقت یا افسانہ" بہت پسند آیا۔ میں عصمت چغتائی کی بہت بڑی fan ہوں۔ وہ ایک باغی قلم کار تھیں مجھے انہوں نے بہت متاثر کیا ہے۔ جدھر بھی ان کا مضمون دیکھا تو سب سے پہلے اسی کی باری آتی ہے۔ جناب جوگیندر پال جی کے افسانوں کے بارے میں کچھ کہنا تو سورج کو روشنی دکھانے والی بات ہے۔ افسانے کا موضوع بالکل مختلف ہے اور دلچسپ۔ تقریباً نومبر میں ان سے ملنے کا انہیں سننے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی کہی ہوئی ایک بات میرے دل میں گھر کر گئی کہ افسانہ لکھنا ہے تو پوری طرح افسانے میں ڈوب جاؤ خود کو بھلا دو۔ اور یہ افسانہ ان کی بات پر پوری طرح اترتا ہے۔

عذرا اصغر صاحبہ کا افسانہ بھی اچھا ہے۔ انہیں 20 صدی میں پڑھنے کا موقع ملا۔ خط بھی لکھا مگر جواب نہیں آیا۔ میری طرف سے انہیں خوبصورت افسانے لکھنے کے لئے مبارکباد ضرور دیجئے۔

"مشتاق نگاہیں" میں جو میلے کی منظر کشی کی گئی ہے وہ بہت ہی خوب ہے۔ میلے کا کوئی بھی پہلو چھوڑا نہیں ہے۔ پڑھتے پڑھتے ایسے لگتا ہے کہ ہم میلے میں گھوم رہے ہیں مگر اس کا end بہت ہی دردناک ہے۔ دل کو چھو جانے والا۔ "کپول دھر کی کہانیاں" میں منشایاد صاحب کا انداز بیاں

بہت پسند آیا۔ ایک شمارہ مل جاتا ہے تو آنے والے شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ آپ سے ایک گذارش کی تھی کہ قلم کار کے نام کے ساتھ ملک کا نام بھی لکھ دیا کریں۔ اچھا لگتا ہے کہ مختلف جگہ سے لوگ ایک platform پر جمع ہو گئے ہیں۔ الگ الگ موتی ایک ہار میں پروئے ہوئے۔

ڈاکٹر رینو بہل

محترم گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم۔

نومبر دسمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ اچھی اور معیاری نگارشات سے مزین یہ رسالہ خوب سے خوب تر کا حامل ہے۔ اس مرتبہ آپ نے ندا فاضلی صاحب کا گوشہ دے کر قارئین اور خصوصاً میرے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کیا ہے۔ ندا فاضلی کی شخصیت، فن اور شاعری کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا۔ میں انہیں صرف شاعر ہی سمجھتا تھا لیکن وہ شاعر کے علاوہ اور بھی بہت کچھ نظر آئے۔

صابر عظیم آبادی

مدیر محترم! سلام و رحمت۔

۲۰۰۹ء کے رخصت ہوتے ہوتے قارئین ادب کے ہاتھوں میں ندا فاضلی صاحب کے قرطاس اعزاز سے سجا سنورا جگمگاتا 'چہارسُو' تھما دیا۔ اس سوغات بے مثل کے لئے سب آپ کے ممنون احسان ہیں۔

ندا صاحب کو اپنی شعری و نثری تخلیقات پر تحقیق کار احباب کی جانب سے جس قدر فراخدلانہ توصیف اور مخلصانہ پذیرائی ملی اُس سے واقعی وہ لکھوں کے درمیاں محسوس ہوئے۔

"شبستانوں کے عاشق" میں ندا صاحب نے جعفری صاحب کے تخلیقی و تنقیدی رویوں، سماجی و حزبی اسلوبوں کا اپنے بہت ہی مختلف تمثیلی و مکالماتی انداز کے ساتھ تعارف کروایا۔ "براہ راست" کرتے ہی چیدہ چیدہ سوالات کے انبار لے کر ان کے یہاں تہذیبی و لسانی، ادبی و تخلیقی تقسیم کی بنا پائی۔ گیت نگاری کے لئے تمام تر منفرد و کثیر خصوصیات کے ساتھ دور حاضر کے عام ڈگر سے ہٹ کر گیت نگار لگے۔ مرے سولا ترے دیوالی ہے جس میں ان کی مختلف الجہات شخصیت کے دلچسپ اور انوکھے شیڈز پڑھنے کو ملے۔ دیواروں کے بیچ کھڑا ندا فاضلی پڑھ کر ذاتی و شخصی زاویوں سے قاری متعارف ہوا اور تخلیقی منظر نامے کے پس منظر سے آگہی پاتا ہے۔ ان کی نظم 'والد کی وفات پر' مختلف نوع کا احساس موانست و قربت لئے ہوئے ہے۔ برسات کا بادل تو دیوانہ ہے کیا جانے / کس راہ سے بچنا ہے / کس چھت کو بھگونا ہے۔ اور گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں / کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے۔ ایسے اور دیگر کئی اشعار ان کے مخصوص جداگانہ شعری انداز کو اجاگر کرتے ہیں۔ 'تم سے محبت ہے' سب کو کسی بھی دانشوروں کے تاثرات عموی ذکر سے

بنی ہوئی خصوصیات کی بنا پر مخلصانہ و محترفانہ تھے....

دوسروں کے خلا کو پُر کرنے کا مشورہ دینے والے بعض اوقات خود میں بھی ویسا ہی خلا لئے ہوتے ہیں۔ خلا پڑھ کر ایسا ہی لگا۔ کہیں وہ تشنہ لگ جائے کی فکر نے ہمیشہ کامیابیوں کی بساط بچھنے کے باوجود ناکامی کے غیر متوقع ریلے کو بھی بڑی دلیری و حوصلہ مندی سے سمیٹا۔ تقدیس کا رشتہ میں تاج محمد کے بیاہ میں وقتوں کے دوران ماضی کے مختلف ادوار کی بازیافت، مخصوص لغت کے وضاحتی تبادلے نے کہانی کو مخصوص پس منظر و پیش منظر کے ساتھ اہم اور دلچسپ بنانے میں معاونت کی.... اور.... یوں بات بدلتی ہوئی معاشرتی و تہذیبی اقدار کے ہاتھوں تقدیس کے رشتے کی پامالی پر ختم ہوئی.... البتہ.... ماتھے کی ترچھی لٹ اور بائیں گال کے تل کی ماہیت کے باوجود تحمیدہ مس نام کی حد تک مانوس رہی۔ سرمایا۔ "مرمر کے" زیر عنوان عصر کے نوبل انعام یافتہ مصنف نجیب محفوظ کا تعارف شخصی و ادبی حوالوں سے بڑی گہرائی و خوبصورتی سے کروایا گیا۔ ایسے عالمی پائے کے عالمی ادب کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کرنا حقیقتاً وقت کی اہم ضرورت ہے۔

کمپوزنگ کی بے احتیاطی و بے توجہی نے 'مرثیہ حسین' کے پانچویں قطعے میں جی سی (گورنمنٹ کالج) کو وی سی (وائس چانسلر) بنا دیا جبکہ چوتھے قطعے کا چوتھا مصرعہ یوں پڑھا جانا چاہیئے۔ "کہ ادبی تقریبات میں کم کم ہی جاتے تھے"....اور.... اگر قطعات کے مابین (جیسا کہ لکھتے ہوئے ہمیشہ اہتمام کیا جاتا ہے) مناسب فاصلہ رہتا تو دیکھنے اور پڑھنے میں خوشگوار تاثر ملتا جیسے کہ سانحہ کربلا کے قطعات کمپوز ہوئے تھے۔

شگفتہ نازلی

عزیز گرامی قدر گلزار جاوید صاحب! تسلیم

حقیقت یہ ہے کہ چہارسُو اپنے نام کی آفاقیت اور افادیت کو بحال رکھنے میں آپ کے ذاتی تعلقات پر انحصار کرتا ہے۔ ادارت، ذمہ داری اور بیداری کی بدولت کامیاب رہا ہے۔ عہد موجود کا المیہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے ادب کا مطالعہ کرنا یا ادب سے دلچسپی رکھنا کم کر دیا ہے۔ ہمارا کلاسیکی سرمایہ طاق نسیاں کی نذر ہو چکا ہے۔ پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی آچکی ہے۔ اسی طرح ادبی جریدے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ بہر حال آپ جیسے دردمند افراد کا دم غنیمت ہے کہ اس عہد بے توقیر میں ادبی جریدے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس کاروبار میں سود و زیاں کو نہیں دیکھا جاتا۔ صرف خلوص، عمل اور خیر عمل کو نگاہ میں رکھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کاروبار کو چھوڑ بھی چکے اور بھول چکے۔

جوہری بند کئے جاتے ہیں بازار سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے

حسن عسکری کاظمی

بخدمت محترم گلزار جاوید صاحب۔

"چہار سُو" بابت نومبر دسمبر ۲۰۰۶ء ملا۔ آپ کا فیضان کرم شامل حال ہے۔ یہ آپ کی اخلاق اور ادبی سربلندی ہے کہ خاکسار کو ممنون احسان کرتے ہیں۔ یقین جانیئے چہار سُو آتا ہے تو بے اختیار طبیعت کچھ پڑھنے کو مائل ہوتی ہے اور کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ مواد (لوازمہ) دل پسند معلومات افزا اور لائق استفادہ ہوتا ہے۔ آپ کی ہمت اور استقامت کو سلام پیش کرتا ہوں کہ حالات نازک تر ہونے کے باوجود آپ اپنی ہی کئے جا رہے ہیں۔ کب تک؟ تاحیات اور بعد آپ کا نام اور کام ناقابل فراموش ہوگا۔ اور آپ "یادگار زمانہ" میں شمار ہوں گے۔ یہ بڑی بات ہے کہ آپ ادب "فروخت" نہیں کر رہے بلا لحاظ مالی منفعت ادب کی "خدمت" کر رہے ہیں۔ زر سالانہ دیکھ کر دل مضطرب اور نگاہ شرمندہ ہوتی ہے ایک پرچہ ملا جس میں مدیر کی اپیل برائے خریدار/خریدار رسالہ بھی شائع ہوئی ہے اور آپ نے با اہتمام قیمت ہی درج کرنا چھوڑ دی۔ اور زر سالانہ ہماری بے شمول ادب دوست، ادب نواز اور علم دوست کی شرمساری اور توجگی کے لئے درج کر دیے ہیں۔

میں نے آج "چہار سُو" آنے سے پہلے اس رسالے کے مدیر صاحب کو خط لکھا ہے جس میں فن سے ہمدردی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "محترم گلزار جاوید صاحب" مدیر چہار سُو زر سالانہ "دل مضطرب اور نگاہ شرمندانہ" درج کرتے ہیں۔ "افسوس صد افسوس" اور گذشتہ کئی شماروں سے یہ درج کر رہے ہیں۔ "زندہ باد گلزار جاوید زندہ باد" آپ آفاقی اقدار رشتوں کی نزاکت اور محبت کے تقاضوں کو جس طرح نبھا رہے ہیں۔ دل کے نہاں داغ عیاں ہیں۔ بہر کیف چہار سُو متاع ادب ہے اور یہ "متاع چہار سُو" ہی کے طفیل ہے جس کی وجہ سے آپ کا "ضمیر" جاگ رہا ہے۔

کوئی ہر آواز سے نگاہ دور ہو برائے چہار سُو ہو جاتی ہے اور ایک سو بیس صفحات کے بعد ہی ٹھہرتی ہے۔ درمیاں میں نگاہ کہاں کہاں رکتی ہے اور عقل و شعور کے در وا کرتی ہے۔ وہ ہے "براہ راست" آپ سے رابطہ عبدالفاضلی سے مکمل شخصی تعارف دیواروں کے بیچ سے نکل کر دیواروں کے باہر بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مضامین معلوماتی، افسانے شعور و آگہی کا مخزن، غزلیات منفرد، حصہ نظم اپنی جگہ منظم، کس کی تعریف کروں کس کو قابل اعتنا "نہ" سمجھوں۔ مشکل میں ہوں، میری مشکل آپ خود ہی آسان کر دیجئے۔

محترم کیا تحقیقی تنقیدی مضامین بھی شامل اشاعت کیے جا سکتے ہیں اور کیا قدیم و جدید تنقیدی کتب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ موضوعاتی سلسلہ وار رجحانات قلم پیش کیے جا سکتے ہیں۔ کیا اردو ادب (شعر و نثر) پر مختلف ادبا/ شعرا اور مضمون نگار حضرات سے کسی ایک موضوع پر فن کے خیالات کا اعادہ پیش کیا جا سکتا ہے آج کل ایسے مضامین کی اشد ضرورت ہے۔ اردو ادب سے متعلق معلومات کا فقدان بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کا علم و ادب دوست قاری بنیادی فکری معلومات سے بہرا مند نہیں اور تشنہ لب العطش العطش پکار رہا ہے۔

ظفر تاج

جناب گلزار جاوید۔

دل مضطرب اور نگاہ شفیقانہ کے ساتھ زندگی کے ساتھ ساتھ ڈھلے کے قلم میں ہاتھوں ہاتھ جلد نمبر ۱۵ شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۰۶ کی رسید اور آمد سال نو پر تہنیت پیش کر رہا ہوں۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

"عبدالفاضلی" پر گوشہ دیکھ کر ذہن کے گوشے میں یا حافظے کے پردہ پر کئی مناظر آئے اور چلے گئے۔ شخص تھیں اس عہد کے ایک محمد مقبول خاص و عام شاعر سے ملتا اور یہ کہہ کر خطاب کرتا۔

دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

یاد آ گیا۔

انور جاوید ہاشمی

مکرم و محترم گلزار جاوید صاحب۔ سلام

مراسلہ "چہار سُو" کا تازہ شمارہ موصول ہوا، اس کرم گستری پر شکریہ۔ ماشاءاللہ حسب سابق معیاری شمولات سے مزین ہے۔ عبدالفاضلی کا خصوصی گوشہ پڑھ کر از حد مسرت ہوئی، موصوف کی شاعری بڑی نکھری اور ستھری گلی ہے جبکہ ان کی پرکشش شخصیت کی طرح۔ آپ نے ان کا گوشہ نکال کے ادبی قرض ادا کیا۔ اس عمدہ مدیرانہ کوشش پر ہماری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔

قلب سلیم میں عبدالعزیز خالد کا نعتیہ کلام شان دار ہے۔ سخن تازہ میں انور سدید، امجد اسلام امجد، صابر آفاقی، نوید سافری، اکبر حمیدی، خیال آفاقی، صدیقی شاہد، ملک زادہ جاوید، سہیل غازی پوری، زبیر کنجاہی، کرامت بخاری، خورشید انور، ارمان نجمی، محترم بہزاد اور طالب انصاری کی غزلوں کے بعض اشعار دامن کش دل تھے۔ اسی طرح نظم عصر میں محسن بھوپالی، امجد اسلام امجد، ناصر شہزاد اور وفا چشتی کا کلام زیادہ متاثر کن تھا۔

پرویز ساحر